محمد عمر میمن

# حصار

آہ ای زندگی منم کہ ہنوز
باہمہ پوچی از تو لبریزم
نہ بفکرم کہ رشتہ پارہ کنم
نہ برآنم کہ از تو بگریزم

— فروغ فرخ زاد

. . . Cervantes taught us that a book is a book is a book: Don Quixote does not invite us into "reality" but into an act of the imagination where all things are real . . .

— Carlos Fuentes, *Myself With Others*

۱

کمرا عالی شان تھا۔ مخملیں صوفے مستطیل متوازی دیواروں کے سہارے بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ یہ اس قدر دبیز اور ملائم تھے کہ اُسے بے اختیار محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے کوئی بے حد لطیف شے سمجھ کر بڑی احتیاط اور شفقت سے دھنکی ہوئی روئی کے ڈھیر پر رکھ دیا ہو۔ فرش پر قیمتی قالین تھا، جس پر خوش نما بیل بوٹے بنے تھے۔ اُس کے پانو ٹخنوں ٹخنوں قالین میں دھنس کر رہ گئے۔ نرم گرم روؤں کا آہستہ خرام پُر عذاب لمس اسے بہت بھلا لگا۔ جدید طرز کا بڑا سا جھاڑ چھت سے لٹک رہا تھا، لیکن ان میں قمقمے تاریک تھے۔ بلور کے شفّاف، بے حد نازک اندام گل دانوں میں موسم کے پھول مہک رہے تھے۔ نیلی دیواروں سے ٹھنڈا طلسم آہستہ رونشے کی طرح رس رس کر یوں ماحول پر اتر رہا تھا گویا یہ رات کے پچھلے پہر کی شبنم ہو جو گھاس کی پلکوں پر دھیمے دھیمے اتر رہی ہو۔ عجیب سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اِس سے آہستہ بہ کر روح پر چھا جانے والی دلوں کی ہمسائگی

کا احساس ہوتا تھا اور بچپن یا اوّلین جوانی کے خوابوں جیسے رازوں کی اٹل سا جھے داری کا۔ اس کا جی چاہا اِس سحر آلود ماحول کے زیر اثر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ جائے۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ معاً اس کی نظر کمرے کے عین وسط میں پڑی منقّش تپائی پر آ کر ٹھٹھر گئی۔ چند آلات، جو اکثر سرکاری پوسٹ مارٹم خانے کی کافوری فضا میں پتھر کی سل پر پڑی برہنہ لاش کے سرہانے ہوا کرتے ہیں، بکھرے پڑے تھے۔ اونگھ جانے کی وہ زبردست خواہش گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی نظریں تپائی سے گویا چپک کر رہ گئی تھیں۔ آلات اس کے ذہن میں مسلسل گردش کر رہے تھے۔ اس پُر کیف دوستانہ ماحول میں اِن کی موجودگی اسے بری طرح کھٹک رہی تھی اور مستقبل میں ہونے والی جانے کن بے لگام زیادتیوں کی نشان دہی بھی کر رہی تھی۔ کمرا گھپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس تاریکی میں بھی تمام اشیا اپنی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ بالکل واضح نظر آ رہی تھیں۔

گھڑی دو گھڑی ٹانگیں آرام سے پسار کے صوفے پر سو جانے کی خواہش ایک بار پھر شدت سے اس کے دل میں ابھری۔ مگر یہ آلاتِ جرّاحی؟— اچانک اس کے ذہن میں غور و فکر کا دروازہ کھل گیا۔ پہلا اور واضح ترین خیال جو آیا وہ یہ تھا: ''میں یہاں کیسے پہنچا؟'' اب اس نے یہاں اپنی آمد اور ان آلات کی موجودگی کے عقب میں کسی محرّک کی تلاش کی پوری کوشش کی: وہ خود تو یہاں نہیں آیا ہے، اور یہ طے ہے۔ بس کچھ یوں ہوا تھا کہ اُمڈتے ہوئے دبیز کہرے نے ہر شے کو اپنی زد میں لے لیا تھا اور ایک غیر مرئی طاقت اسے یہاں گھسیٹ لائی تھی، پھر کمرے میں دھکیل کر باہر نکلنے کے سب دروازے اس پر بند کر دیے تھے۔ پھر اس طلسماتی ماحول میں جیسے گھنٹوں گزر گئے۔ لمحے ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں رہے، لیکن کوئی نہ آیا۔ نہایت ڈراؤنے خیالات اس کے ذہن میں تیزی سے آ جا رہے تھے اور اس کی روح ایک نامعلوم ہیبت سے لرزنے لگی تھی۔

وہ بیٹھا یوں ہی مصروفِ تخمین و ظن تھا کہ معاً اسے اپنے عین سامنے دو آنکھیں نظر آئیں: معصوم، ہم درد، نہتّے دلوں کی ہمسائگی کی امین، بے حد منوّر— لحظہ بھر کے لیے وہ ڈر سا گیا۔ اسے محسوس ہوا گویا وہ آنکھیں ایک مستقل وجود ہیں اور دیوار سے چسپاں مسلسل اسے گھورے جا رہی ہیں۔

اچانک باہر شور ابھرا۔ عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی، جیسے مختلف طاقتیں اپنی انتہائی شدت کے ساتھ گتھم گتھا ہوں اور اس لمحۂ حشر ساماں میں پڑا ہوا فرنیچر بری طرح اِدھر اُدھر پٹخا جا رہا ہو۔ پھر تو چھین جھپٹ اور مار دھاڑ کا وہ رن پڑا کہ الامان والحفیظ! الجھی الجھی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں:

''یہ کوئی انسانیت ہے! تم نے اسے یہاں کیوں پکڑوا بلایا ہے؟ کیا ستم ہیں جو تم اس پر یہاں نہ توڑو گے! اسے انتظار کی اذیت میں کیوں ڈال رہے ہو؟ جاؤ، کم از کم اسے یہاں اس کی موجودگی کا سبب ہی بتا دو!''

''تم پھر یہاں چلے آئے ہو؟ جاؤ، اپنے بندی خانے کا رخ کرو! ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا۔'' یہ آواز بڑی بارعب، مستحکم، اور سفّاک تھی۔

''میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں مذبح سے کیسے جا سکتا ہوں؟ میں تمھیں خون نہیں کرنے دوں گا۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک تمھارے ہتھیاروں میں چمک، ان کے آہن میں سختی، اور ان کی دھار میں کاٹ باقی ہے۔''

''اسے لے جاؤ!'' وہی مستحکم آواز گرجی۔

پھر جیسے کئی آدمی مل کر اس پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ کانچ، لکڑی، اور دھات کے ٹکرانے، ٹکرا کر چور چور ہونے، اور فرش پر چاروں طرف ریزہ ریزہ بکھر جانے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

''دیکھا تم نے، اب تم یہاں سے لے جائے جا رہے ہو۔ ہا—ہا—ہا۔''

''دیکھ لیا۔ لے جائے جانا، ہنہ، لے جائے جانا شکست نہیں۔ اس طرح لوٹ آنے کا امکان باقی رہتا ہے۔ بدنصیبی تو یہ ہے آدمی شکستہ دل ہو کر خود لوٹ جائے۔ ہاں، میں خود نہیں جا رہا ہوں۔ طاقت اور ہتھیار نہتّے مدمقابل کو بے بس کر دیتے ہیں۔''

وہ اپنی روئی کے ڈھیر والی گدازنشست پر تھرّا کے رہ گیا۔ پھر ایک ناقابلِ بیان استعجاب نے اس پر یورش کر دی۔ شکوک کا ایک پورا قافلہ، جوابوں کے لیے ترستے کتنے ہی سوال اس کے دماغ میں کلبلانے لگے: میں کہاں ہوں؟ یہ آوازیں کیسی ہیں؟ اور بند دروازوں اور ٹھوس دیواروں کے باوجود کیسے اندر درّاتی چلی آ رہی ہیں؟

دروازہ یک لخت ایک جھٹکے کے ساتھ اتنے غیر متوقع طور پر کھلا کہ وہ اپنی جگہ پر کسی اَن دیکھے خوف سے اچھل کر رہ گیا۔ دو آدمی اندر گھستے چلے آئے انھوں نے گہرے سرخ رنگ کی عبائیں پہن رکھی تھیں، جن کی آنچ دیتی سرخی سے اس کی آنکھیں لمحے دو لمحے کے لیے گویا جھلس کر رہ گئیں۔ دس بارہ فٹ سے کم تو ان کا قد کیا رہا ہوگا! ایک کی تو ناک ہی سرے سے غائب تھی۔ ناک کی جگہ بس ایک گپھا سی تھی، جس کے پیچھے تازہ گوشت کا سرخ سا لوتھڑا تنفّس کے زیر و بم پر ہل رہا تھا۔ دوسرے کی ایک انچ چوڑی، یعنی حیرت انگیز طور پر تنگ پیشانی کے عین وسط میں صرف ایک گرم، جلتی ہوئی آنکھ تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں آہنی گرز تھے۔

''منکر! دیکھو کیسا معصوم بنا بیٹھا ہے... جیسے مجرم کا ہے کو ہوگا۔''

''ہوں،'' دوسرے نے اقرار میں سر کو خفیف سی جنبش دی اور بولا، ''یہ سالے سب حرام زادے آدم کی نسل سے ہیں۔ خیر، ہمیں کیا۔ بس نکیر، اب تو تیاری شروع کر دو۔''

ان کی مضحکہ خیز صورتوں، عجیب وغریب حلیوں، اور احمقانہ مکالموں کے سبب اس ڈراؤنے ماحول میں بھی اسے ہنسی آ گئی۔ ''تو یار لوگ گویا میرے اعمال کا حساب لینے تشریف لائے ہیں!'' وہ دل ہی دل میں بولا۔

اب اس کا خوف کسی حد تک زائل ہو چکا تھا، جس کی ایک وجہ ان دونوں کا عجیب حلیہ تھا، تو دوسری طرف ایک بڑی وجہ خود اس کا اپنی معصومیت کا احساس: ''لینے دو حساب! مایوسی ہوگی!'' اب وہ نہایت تمسخرانہ دل چسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ دونوں کچھ کہتے، خود اس نے ہی بڑی بے پروائی سے انھیں مخاطب کیا: پہلے تو تم دونوں نہایت شرافت سے اپنا تعارف کراؤ۔''

اس پر وہ دونوں نہایت خشم گیں تیں جلتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے ایک ساتھ بولے: ''ہم منکر اور نکیر ہیں۔ تم ہمیں اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔''

''بہت اچھا منکر اور نکیر، ابھی تو میں زندہ ہوں۔ کیا لینے آئے ہو یہاں؟ ذرا میری موت تک تو رکے رہتے۔''

وہ ہنسنے کے بجائے جھلاّ گئے۔ پھر نکیر نے کہا، ''تم مجرم ہو۔ ہم تمھیں سزا دینے آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں بہت برا آدمی ہوسکتا ہوں؛ لیکن ابھی زندگی سے میں نے اپنا آخری حساب بے باق نہیں کیا ہے۔ تمھاری آمد قبل از وقت ہے۔''

''قبل از وقت؟ نہیں، تم مر چکے ہو۔''

''اچھا؟ خیر، میرا جرم؟''

''ہمیں خبر نہیں۔ ہمارا کام صرف احکام کی بجا آوری ہے۔ لیکن تم یقیناً مجرم ہو۔ تم بہت بولتے ہو اور بڑے نڈر معلوم ہوتے ہی۔ تم جیسا آدمی معصوم نہیں ہوسکتا۔ بالکل نہیں۔''

''تو پھر تمھیں مایوسی ہوگی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے کوئی جرم ورم نہیں کیا۔''

''بکومت! تم سب یہی کہتے ہوئے آتے ہو۔ ایکو ایک۔ مگر آج تک ہمیں کوئی معصوم نہیں ملا۔'' منکر نے ناگواری سے کہا۔

''اچھا تو تم مجھے سزا دو گے؟ ہنہ! مگر تم نے اس سجے سجائے، دلوں کی ہمسائگی کا ریشمی احساس دلانے والے ڈرائنگ روم میں کیوں پکڑ وا بلایا ہے؟ یہ سراسر دھاندلی ہے...''

''کہیں تم بھاگ نہ جاؤ۔ رہی دھاندلی کی بات، تو بھئی دھاندلی ہمارے منصب کی انجام دہی کے مختلف ذرائع میں سے ہے۔''

اداسی، اچانک، اس کے دل میں اتر آئی۔ دل کی یہ اداسی، روح کا یہ رنج اس قدر حقیقی اور شدید تھا کہ اس کی نظریں

آپ ہی آپ جھکتی چلی گئیں۔ وہ جیسے خود اپنے میں گردن گردن غرق ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد نظر اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا— ان کی طرف جو اسے سزا دینے کی تیاریوں میں، اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، مصروف تھے۔ پہلے انھوں نے لکڑیاں جوڑ کر ان پر پیٹرول کے چند چھینٹے دیے اور دیا سلائی دکھا دی۔ جب لکڑیاں اپنی بھوکی زبانیں لپکانے لگیں تو انھوں نے ان پر لوبان چھڑکی۔ دم بہ دم میں پورا کمرا کافوری دھویں سے بھر گیا، اور پوری فضا عجیب سماوی مقدّس رنگوں سے بھر گئی۔ پھر دونوں نے ہاتھ جوڑ کر، سحر زدہ سے، کسی نشے سے بتدریج بند ہوتی ہوئی اپنی تین آنکھوں کے ساتھ نہایت خشوع وخضوع سے دہرایا:

> قسم ہے بہتے دریاؤں کی روانی کی؛ شکم کے اندھیروں اور سورج کی لازوال روشنی کی؛ اور ڈوبتے مہتاب کی؛ اور قسم ہے نورانی پیکروں کی جو ڈوبتی شام میں بڑی سختی سے جان نکالتے ہیں، جو بہتے ہوئے چلتے ہیں، پھر دوڑتے ہیں، ان ہواؤں کی طرح جو مثل آندھیوں کے چلتی ہیں اور اپنی ٹاپوں سے چنگاریاں چھڑکتی جاتی ہیں، روندتے ہوئے ان کو جو— اے دودھ سے بھری گندم کی بالیوں کے مالک!— تیرے دین کو جھٹلاتے ہیں۔ بڑی خرابی نصیب ہے ایسوں کا جو کذب ونفاق کی پشت پناہی کے لیے اپنی روح کا بیش قیمت جوہر ضائع کر دیتے ہیں— کہ آج تک بنجر زمین میں تخم ریزی سے کسی نے کچھ نہیں حاصل کیا۔ کیا انھیں گذشتہ اقلیموں کے زلزلوں اور آندھیوں اور اولوں سے تباہ کر دیے جانے کا علم نہیں؟ بے شک بڑے خسارے میں ہیں ایسے لوگ! اور آج، خوبانیوں کی اشتہا انگیز کنواری مہک کے مالک! ہم تیرے حضور ان کی ذرّیت کے ایک اور فرد کو عذاب دینے کے لیے لائے ہیں، تاکہ اس کی روح سے ابلتا ہوا متعفّن پیپ اور اس کے مسخ شدہ گوشت کی چراند آنے والی نسلوں کے لیے بدبختی اور خسارے کی نشانی بن سکیں؛ سو، روشنیوں اور اندھیروں، گندم کے خوشوں سے لہلہاتے سبز کھیتوں اور دمشق کے انگوروں کے باغوں کے مالک! ہماری جانب سے یہ نذرانہ قبول کر!

دونوں تمنا اور شوق اور حوصلے کی ناقابل بیان سرشاری سے مدہوش ہو کر اس کی طرف بڑھے۔ معاً اس کی نظر دیوار پر جا پڑی۔ وہ تاباں آنکھیں، جن سے غموں کی اٹل ہمسائگی مترشّح تھی، ابھی تک وہیں چسپاں تھیں۔ نظریں چار ہوئیں۔ وہ بڑی تیزی سے اپنی افسردگی کے سائبان سے نکل آیا۔ کوئی قوت وحی کی طرح اس کے دل پر نازل ہو رہی تھی۔

''تیار ہو جاؤ،'' منکر اور نکیر نے اپنے خنجروں کی انیوں کو چومتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو!'' وہ چیخ کر بولا۔ ''تم نے اندھی رات کے بدمست، ناعاقبت اندیش، سبک دل ملّاحوں کی عارضی مسرت کے لیے کبھی کوئی جذبہ محسوس کیا ہے؟''

''جذبہ؟...نہیں،'' وہ ایک ساتھ بولے۔ ''شراب پینا حرام ہے۔ ان بدمست ملاحوں کو بھی اپنے کیے کا حساب دینا پڑے گا۔ خیر، مطمئن رہو، جانب داری ہمارا شیوہ نہیں۔''

''کیا تم نے کبھی خواب دیکھے ہیں؟''

''خواب؟— یعنی چہ؟''

''خواب!— زندہ رہنے کے لیے خواب دیکھنا بہت ضرو...''

''نہیں! تم غلط کہتے ہو۔ زندہ رہنے کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔''

''اس وقت بھی جب 'دل بہ بخارا و بتان تراز'؟''

''ہاں، اس وقت تو اور بھی۔''

''خیر وہ تو ہے ہی۔ مگر ذرا غور کرو تو ایک مرحلے پر نماز پڑھنے اور خواب دیکھنے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لاحول ولا... میں یہ سب تم سے آخر کیوں کہہ رہا ہوں؟ جانے دو۔ تم نے خواب نہیں دیکھے تو تمھیں شعر و شاعری سے بھی کیسے دل چسپی ہوگی ...''

''شعر و شاعری؟'' دونوں ہکّا بکّا رہ گئے۔ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''ظاہر ہے، ظاہر ہے،'' وہ بولا، ''تمام روشنیوں اور اندھیروں کے مالک، تمھارے مالک کو نیند تو کیا نیند کی جھپکی تک نہیں آتی اس کے خواب دیکھنے کا سوال تو سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ خواب دیکھنا رہا یک طرف، تمھارے مالک کو شعر و شاعری سے ویسے ہے عناد ہے۔ یہ سب کچھ سہی، میں ایک دو شعر تمھیں پھر بھی سناؤں گا۔ ممکن ہے کبھی سہواً تمھاری آنکھ جھپک جائے اور تم خواب دیکھنے کے اہل ہو سکو۔ یہ سب نہیں تو پھر یہی کیا کم ہے کہ اپنے اعمال کا حساب پیش کرتے وقت شاید یہی شعر تم اپنے مالک— گلاب کے پھولوں کے مالک، لاش پر ٹھونگے لگا لگا کر گوشت نوچتے ہوئے گدھ کے مالک— کو بھی سنا سکو...''

''یار نکیر،'' منکر نے اپنے خوشہ چیں کا شانہ ہلاتے ہوئے دہشت سے کہا، ''اس کا کام جلدی ختم کرنا چاہیے۔ یہ کم بخت مرنے جا رہا ہے لیکن ہمارا حساب لینے سے باز نہیں آتا۔''

''میرا کام تو تم ختم کرو گے ہی، مگر پہلے وہ شعر تو سن لو۔ میں مر گیا تو پھر کون سنائے گا؟''

''خیر سنا بھی چکو،'' نکیر نے جواب دیا۔ ''جلدی کرو۔ ہم اب اور انتظار نہیں کر سکتے: ہمیں آج جی آج تم جیسے ڈھائی سو حرامیوں کا حساب بے باق کرنا ہے۔ چلو، ہاں...''

''تو لو:

روی بمحراب نہادن چہ سود  دل بہ بخارا و بتان تراز
ایزدِ ما وسوسۂ عاشقی  از تو پذیرد نپذیرد نماز

''تم اس سے کہ دینا کہ ہمارا خمیر مٹی سے اٹھا ہے—اور مٹی کو خواب دیکھنے کی صلاحیت ودیعت ہے—روشنی سے نہیں۔طین وزیتون کی اور ڈوبتے سورج کی قسم، ہم جو مٹی سے اٹھے ہیں، خواب دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ہم روشنی کے غیر مرئی گوشت سے غذا نہیں حاصل کر...''

''بس، بس۔وقت کم رہ گیا ہے۔چلو!''

نکیر اسے کھینچتا ہوا لکڑیوں تک لایا اور منکر نے خنجر کی دھار کو ایک بار پھر چومتے ہوئے ہاتھ لہرایا۔

وہ دو آنکھیں—بے حد منور اور ہم درد آنکھیں جو ابھی تک دیوار سے جڑی تھیں—یکا یک اپنی جگہ سے غائب ہوگئیں۔بڑے زور کی کھڑبڑاہٹ ہوئی اور دروازہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ایک تاریک سے پیکر نے جست لگائی اور دھم سے منکر اور نکیر کے بیچ میں آ کودا۔

''ارے، یہ کم بخت پھر آ دھمکا!'' پھر دونوں بہ یک وقت چیخے، ''چل بھاگ!''

''ہاں، میں بھاگ آیا ہوں۔اور یہ دیکھو، میں پھر آگ چرا لایا ہوں۔یہ دیکھو!'' اس سیاہ پیکر نے یہ کہتے ہوئے کمبل کھینچ کر جسم سے علاحدہ کر دیا: سینے پر، ٹھیک دل کی جگہ، آگ سی جل رہی تھی۔اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''یہاں، دیکھو یہاں، یہ بالکل محفوظ ہے۔تم اس تک نہیں پہنچ سکتے، اور،'' پیکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''اور اب تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ہا—ہا—ہا—'' گھپ اندھیرے میں اس کے دانت بڑے خوف ناک طور پر چمک رہے تھے۔

''ارے کوئی ہے؟'' منکر چلایا۔''کس نے اسے چٹان سے علاحدہ کر دیا ہے؟ اور وہ کم بخت شاہین...وہ کہاں مر گیا ہے؟ کوئی ہے؟'' پھر قدرے انتظار کے بعد، ''شاید نہیں۔اچھا تو پھر، نکیر، تم جاؤ اور آہنی زنجیر کے ساتھ اسے چٹان سے کس دو۔اور ہاں، شاہین سے...''

''میں یہاں سے نہیں جاؤں گا! اور تم مجھے واپس چٹان سے نہیں جکڑ سکتے! اور وہ شاہین اس آگ میں جھلس کر رہ جائے گا! اور اب تم اس آدمی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے!'' پیکر نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

کمرا تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔عجیب دھما چوکڑی مچنے لگی۔پھر اس عجیب الخلقت، تنگ سی پیشانی والے منکر نے کہا، ''دیکھتے رہو، میں ابھی تمھارے سامنے اس کا قصہ پاک کیے دیتا ہوں،'' اور بڑی عقابی پھرتی سے کمرے کے وسط میں پڑی تپائی کی طرف جھپٹا۔اتنے میں وہ تاریک پیکر سرعت سے منکر کی جانب لپکا، لیکن نکیر نے اس کی پیش قدمی روکتے ہوئے اسے اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا اور سانپ کی طرح اس کے جسم کے گرد لپٹ گیا۔

''اچھا تو تم مجھے بے بس کر دینا چاہتے ہو۔خیر...'' یہ کہ کے پیکر نے آزاد ہونے کی پوری کوشش کر ڈالی۔وہ مکملاً آزاد

تو نہ ہوسکا، لیکن کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر سینے سے کمبل ضرور علاحدہ کرلیا۔ درایں اثنا، منکر لپک کر تپائی سے خنجر اٹھا چکا تھا۔ اندھیرے میں خنجر کا پھل چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور برّاں دھار کے سہارے کتھئی خون جہاں تہاں جما نظر آ رہا تھا۔

خنجر دیکھ کر اسے پھریری سے آ گئی۔ پھر اس نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کر کے ایک جست لگائی اور دور جا پڑا۔ منکر اس کی طرف لپکا تو اس تاریک پیکر نے سینے میں فروزاں آگ سے مٹھی بھر کے ٹھیک منکر کے خنجر تھامے ہاتھ پر دے ماری۔ دیکھتے دیکھتے خنجر کا سارا آہن موم بن کر بہ گیا۔

منکر کی ہزیمت پر نکیر کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔ آنِ واحد میں اس نے پیکر کو زیر کر کے نیچے پٹخ دیا، اور مضبوطی سے اس کے سینے کو پھر کمبل سے ڈھانپ دیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا اور خنجر والے ہاتھ کو ہوا میں بلند کیا۔ اور اب بس وہ خنجر اس کے سینے میں اتارنے ہی والا تھا کہ...

...جیسے بہت سارے آہنی گولے کسی نے بھرپور قوت سے اس کے سرہانے دھرے پیتل کے تھال میں دے مارے ہوں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا ذہن بری طرح جھنجھنا رہا تھا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور یہ غیر انسانی حرکت ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم شخصیت والے اس آدمی کی تھی جس نے گذشتہ تیس سال میں نماز ہمیشہ اپنے وقت پر پڑھی تھی، اور جو منہ اندھیرے ہی اٹھ کر آنگن میں آ کر دن بھر کی ضرورت کے لیے چلمیں بھرنے کا عادی تھا۔ حسب دستور اس وقت بھی وہ چلمیں بھر کر آ رہا تھا کہ آنگن میں پڑی خالی بالٹی نظر آئی۔ چلموں کے ساتھ ساتھ وہ بالٹی بھی اٹھا تا لایا تھا اور اب برآمدے میں ٹھیک اس کی چارپائی کے سرہانے زور سے پکّے فرش پر ڈال دی تھی۔ کنڈا دھڑ سے بالٹی کے آہنی لیکن خالی جسم سے ٹکرایا۔ نتیجتاً: بہت سارے آہنی گولوں کے پیتل کے تھال میں گرنے کی آواز—

خنجر کی چمک سے بالٹی کی جھنک تک کے سفر میں کسی مرحلے پر گویا اس کے خلیے الٹ گئے۔ یہ سب اس قدر بھیانک تھا کہ چند لمحے کے لیے اس کا ذہن روشنی اور اندھیرے کی درمیانی سرحد پر معطل ہو کر رہ گیا۔ ایک جھنجھناہٹ تھی— مسلسل، ناپیدا کنار۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ آخر—

۲

برآمدے میں سیلی ہوئی تاریکی نے جونک کی طرح اپنے بے شمار پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ اس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ اسے یاد آیا آج صبح اس کا دوسرا پرچا ہے۔ پھر اس نے سوچا اٹھ کر ذرا وہ پوائنٹس ہی دہرا لے جو سال بھر کی محنتِ شاقّہ کے بعد اس نے خاص طور پر آج کے دن کے لیے تیار کیے تھے، لیکن ابھی تک اس

کے دل میں وہی گڑبڑاہٹ جاری تھی جو ریل گاڑی کے گزر جانے کے بعد بھی متوازی چلتی پٹریوں کے قلب میں دیر تک لرزتی رہتی ہے...

جب، آخر کار، اس کے حواس ٹھکانے آئے تو ساتھ ہی نفرت کرنے، غصے سے خود اپنے ہی چیتھڑے اڑا دینے کی وہ پرانی، کھوئی ہوئی طاقت لوٹ آئی۔ یہ کم بخت بھاری بھرکم آدمی— کہ جس کی شخصیت کی تعمیر میں خوابوں نے کوئی حصہ نہ لیا ہو، جس میں شمالی اقلیموں میں ریزہ ریزہ گرتی، اونگھتی، بڑی پُرعصمت برف کی غنائیت کا کھردرا لیکن بنیادی احساس تک نہ ہو، نہ ہی دور پانیوں میں اندھی آدھی رات کے بدمست لیکن سبک دل، ناعاقبت اندیش ملاحوں کی عارضی مسرت کے لیے کوئی جذبہ ہو، اور جسے وہ بچپن سے آج تک بلاناغہ ہر روز دیکھتا آیا ہے— کس قدر نامعقول واقع ہوا ہے۔ یہ ہمارے گھر سے جا بھی نہیں چکتا۔ بیٹھا بیٹھا وقت بے وقت حکم چلاتا رہتا ہے، کچھ اس دبدبے کے ساتھ گویا ہمارا نجات دہندہ یہی ہو، اور پھر حکم اس طرح دیتا ہے کہ سرتابی کی صورت میں زبان گدّی سے کھینچ دے گا۔

اسے بھاری بھرکم جثّے والے آدمی سے سخت بیر تھا، اور اس آدمی کو بھی گویا اس سے ازلی نفرت تھی: جب بھی وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہوتا، یہ آکر اسے کسی نہ کسی غیر ضروری کام میں الجھا دیتا۔ اس نے دو ایک بار گھر والوں سے شکایت بھی کی، مگر وہ سب گویا اسی کے خوشہ چیں تھے، یا مجبور تھے، یا خائف تھے، یا اس کی شخصیت سے ہراساں، جیسے اس کا وجود ایسا غلاف تھا جس نے ہر فرد کو ڈھانپ لیا تھا۔ یا اگر یہ سب نہیں تھا تو پھر ان سب نے مل ملا کر اس کے خلاف کوئی بڑی گھنونی سازش کر رکھی تھی۔

اور میں— وہ جس نے ہری پیاز پر گرتے قطرے کی شبنمی دل سوزی کو محسوس کیا ہے— میں آخر اس کی شخصیت سے مرعوب کیوں ہوں؟

اسے محسوس ہوا وہ اس معاملے میں قطعی بے بس ہے۔ تنہائی میں جو چاہے اس کے خلاف سوچ سکتا ہے، لیکن منہ در منہ اس کی ساری قوتِ گویائی بڑے پُراسرار انداز میں سلب ہو کر رہ جاتی ہے، اور وہ سارا احتجاج بھول بھال کر بڑی رضامندانہ فروتنی سے گھگھیانے لگتا ہے۔

اس وقت تک تو اماں اٹھ جاتی ہیں... آج کیوں نہیں اٹھیں؟ اس نے سوچا اور ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے چار ہی بجے تھے۔ ہر طرف ہو حق اندھیرا اور سکوت تھا۔

بھاری بھرکم آدمی، شب خوابی کے لباس میں آنگن میں ٹہل رہا تھا۔ حسب معمول اس نے بیڑی بھی سلگا لی تھی۔ وہ اٹھا اور اندر جا کر ٹھنڈے پانی کے دو چار چھپاکے منہ پر دیے۔ آنکھیں کچھ جلیں تو سہی مگر جلد ہی انھوں نے ٹھنڈے پانی کی کاٹ سے سمجھوتا کر لیا۔ اس نے کمرے میں آکر ٹیبل لیمپ کا بٹن دبایا۔ روشنی نہ ہوئی۔ الفاظ اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دے

رہے تھے، اس لیے اس نے بہت زیادہ پروانہ کی اور آموختہ دہرانے بیٹھ گیا، لیکن ذہن جلد ہی گذشتہ روش سے ڈھلک گیا: اگر وہ خنجر مار ہی دیتا تو؟—

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اسے مکان کے عقبی گودام میں کھڑ کھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بدک کر اٹھ پڑا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے گودام کا فاصلہ طے کیا۔ گودام میں صدیوں کا کاٹھ کباڑ اَٹا پڑا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا: وہی بھاری بھرکم آدمی، جس نے گذشتہ تیس برس میں کبھی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہ پڑھی تھی، ایک کونے میں پڑی آبائی کتابوں کے انبار میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ دماغ چل گیا ہے شاید! اس گھر کی ہر ہر چیز کو یہ ہر وقت بلا استحقاق، بڑی آزادی سے الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ اور اب یہ ہمارے اجداد کی محنتوں کے دفینے تک پہنچ گیا ہے۔

بھاری بھرکم، دلوں کی ہمسائگی کے جذبے سے عاری آدمی نے جب اسے دیکھا تو کرخت آواز میں حکم داغا: ''جاؤ، جا کر ناشتا بناؤ! جلدی! اور ہاں، چلم میں آگ رکھ کر ذرا حقہ بھی تازہ کر لینا، اور میرے غسل خانے میں ایک بالٹی پانی بھی ڈال دینا۔ آج تمھاری ماں نہیں اٹھیں گی۔''

اب وہ آدمی کتابوں کے انبار سے ''کوک شاستر'' کا ایک قدیم، پھٹا پرانا، مصوّر نسخہ نکال چکا تھا۔

''مگر آج میرا دوسرا پرچا ہے۔'' یہ عمر میں پہلی بار اس آدمی سے کی گئی مخالفت تھی۔ لیکن، اسے محسوس ہوا، اس ایک مخالفانہ جملے کی ادائگی کے بعد اس کی تمام تر قوت مدافعت جواب دے گئی ہے۔ اگر اس شخص نے مزید ایک جملہ کہا تو وہ انجام کار اس کے احکامات کی بجا آوری کے لیے تیار ہو جائے گا۔

''میں کچھ نہیں جانتا،'' بھاری بھرکم آدمی درشتی سے غرایا۔ ''جلدی کرو! دیکھتے نہیں، میں بوڑھا آدمی ہوں اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ بلا چون و چرا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ اور وہ بھاری بھرکم آدمی، بہت بارعب آدمی، ''کوک شاستر'' کا قدیم، مصور نسخہ ہاتھ میں لیے اس کمرے میں رینگ گیا جس میں امی سو رہی تھیں۔ پھر اس نے اندر سے چٹخنی چڑھا دی، اور پھر تاریکی کے سرد تیر چاروں طرف بکھر گئے۔ کوئی اَن جانی قوت اسے باورچی خانے کے بجائے گھسیٹ کر بند کمرے کی سرحد تک لا کر چھوڑ گئی۔

اس کے ادراک کی تیزی امکان کی حد سے باہر نکل چکی تھی۔ جیسے تیز ہوا میں کوئی بند کتاب آپ ہی آپ کھل جائے اور آپ ہی آپ ایک ایک کر کے اس کے سارے اوراق پھڑ پھڑا جائیں۔ پھر کچھ کھسر پھسر، پھر ایک ایسی آواز جو کسی چٹان کے سرنگوں ہو جانے سے پیدا ہو، پھر جیسے کسی نے کسی کے بند قبا چاک کر دیے ہوں، پھر الجھی الجھی سے سانسیں جو وقفے وقفے سے آ رہی ہوں اور جن میں ہلکی ہلکی لرزش ہو۔

اور آج امی نہیں اٹھیں گی، اور وہ آدمی، جس کو دیکھتے ہی خوابوں سے ایمان اٹھ جاتا ہے، اندر ہے۔ امی تنہا ہیں۔ امی تو ازل سے تنہا ہیں، اور ازل ہی سے وہ آدمی رات کے پچھلے پہر امی کے کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے: فوجیں لڑتی ہیں، میدان میں گرد اڑتی ہے، خون بہتا ہے، حریفین میں سے ایک ہتھیار ڈال دیتا ہے، مدافعت ختم، بس، دو بے بس کیڑے، ایک دوسرے میں پیوست، دھیرے دھیرے کنویں کے قعر میں اترنے لگتے ہیں، رفتہ رفتہ، ہولے ہولے، ڈوبتے ہی جاتے ہیں۔ سطح پر وہ مبہم لرزش بتدریج غائب ہو جاتی ہے اور پانی ساکت ...لیکن جب ایک فوج کا مقسوم ہی سپر ڈال دینا ہے تو یہ روز روز کی صف آرائی کیوں؟ اس نے بیدار ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا مگر وہ بیدار کہاں تھا۔

اور یہ بھاری بھرکم شخص، بن بلایا مہمان — یہ گھر سے ٹلتا ہی نہ تھا۔ اس کی رگیں تن گئیں اور سارے بدن میں کھنچاؤ کی وہ شدید کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں سے خود اپنی ذات ہی کو تختۂ مشق بنا ڈالا۔

''میں اسے قتل کر دوں گا! میں اسے قتل کر دوں گا!''

وہ ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس کا ذہن سوچنے سمجھنے سے عاری ہو چکا تھا۔ معاً اندر سے درّاتی چلی آتی اس بھاری بھرکم شخص کی آواز سے خاموشی کا ہر گوشہ بھر کر چھلک اٹھا: ''تم ناشتا تیار کرو گے اور یہاں نہیں کھڑے رہو گے!''

وہ اپنی جگہ پر دم بہ خود رہ گیا۔ دیواریں ٹھوس پتھر کی اور تین فٹ موٹی تھیں۔ پھر ان کی تعمیر میں کانچ کو بھی کوئی دخل نہ تھا۔ وہ ہڑبڑا کر باورچی خانے میں رینگ گیا۔

۳

جب وہ سارا کام نمٹا کر نکلا تو دیر ہوئی کہ تاریک صبح طلوع ہو چکی تھی۔ مگر اس صبح کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کب رات ہوتی اور کب صبح — ہر وقت سیاہی در و بام پر مسلّط رہتی۔ اور ایسی ٹھوس کہ ٹوٹ بھی نہ سکے۔

اس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے، میز سے وہ کاغذ اٹھائے جن پر پوائنٹس لکھے تھے، اور بھوکا پیاسا چوروں کی طرح گھر سے کھسک گیا۔ اسے ڈر تھا کہ مبادا بھاری بھرکم شخص کی نظر اس پر پڑ گئی تو بس وہ امتحان دے چکا، کہ اس کو دیکھتے ہی اس کا سارا ارادہ بَہ پڑے گا۔ پھر وہ اسے، اپنی تجربہ کار عیاری سے، کسی نہ کسی غیر ضروری کام میں الجھا دے گا اور امتحان گاہ میں داخلے کا وقت نکل جائے گا۔

وہ شتابی قدموں میں صدیوں کی سوزش لیے آندھیوں کی طرح گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ امتحان گاہ کی دہلیز پر پہنچ کر وہ تھکن سے چور ہو کر گر پڑا۔ ہال بھر چکا تھا۔ کوری کاپیاں اور پرچے کب کے تقسیم ہو چکے تھے۔ لڑکے

گردنیں جھکائے لکھنے میں مصروف تھا۔ اور وہ—وہ دہلیز پر منہ دیے ہانپ رہا تھا۔ ''اندر داخلے کا وقت نکل چکا ہے!''—اسے کچھ ہوش تھا تو بس اتنا کہ اب وہ امتحان نہیں دے سکتا۔ ''انھوں نے میرا انتظار بھی نہ کیا۔ پل بھر بھی نہیں۔''

''مجھے اس کریہہ صورت آدمی نے روک لیا تھا۔ مجھے اندر آنے دو۔ دیکھو، میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ سچ، مجھے اس نے روک لیا تھا۔ یہ دیکھو، میں سیدھا ناشتا بنا کر آ رہا ہوں، اور میرے ہاتھوں سے کوئلے کی سیاہی ابھی تک لپٹی ہوئی ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر اِن وجی لیٹر سے کہہ رہا تھا اور اب اس نے اپنی کوئلے کی گرد سے سیاہ انگلیاں بھی اس کے آگے کر دی تھیں۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اِن وجی لیٹر نے نہایت خشم گیں نظروں سے اسے گھورا اور چلایا: ''بھاگ جاؤ! داخلے کا وقت کبھی کا نکل چکا!''

''اِن وجی لیٹر،'' وہ بولا۔ آنسو ٹپ ٹپ پکّی خوبانیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ''اِن وجی لیٹر، کیا تم نے کبھی دور پانیوں میں اندھی آدھی رات کے بدمست لیکن سبک دل بڑے ناعاقبت اندیش ملاحوں کی عارضی مسرت کے لیے کوئی جذبہ محسوس کیا ہے؟''

''جذبہ؟'' اِن وجی لیٹر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ''زندہ قوموں کی نظر گھڑی کی رفتار پر ہوتی ہے۔ جب تم یہ جان لیتے ہو کہ ان کی آخری منزل تمھارے شکم کے اندھیروں میں ہے، تو تمھارے لیے دودھ بھری گیہوں کی لہلہاتی بالیوں کا سارا حسن، ساری غنائیت ختم ہو جاتی ہے۔'' وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ''اچھا آ جاؤ!—'' اس نے انتہائے کار کہہ ہی دیا۔

اور وہ پوائنٹس—وہ پوائنٹس تو میں نے دیکھے ہی نہیں! دفعتاً اس کی نظروں کے آگے بھاری بھرکم شخص کی شعلہ بار آنکھیں گھوم گئیں اور سارا مطالعہ آہستہ آہستہ ذہن سے خارج ہونا شروع ہو گیا۔ خدایا—اِن وجی لیٹر کے ہاتھ سے کاپی اور پرچا تقریباً جھپٹتے اور اپنی نشست کی طرف دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اس نے بے بسی سے سوچا—خدایا، کیا میں کبھی ان گرم، سرخ آنکھوں کے حلقے سے باہر نکل بھی سکوں گا؟

پرچا دیکھتے ہی اس کے حواس کوچ کر گئے۔ پھر بھی طوعاً و کرہاً وہ اسے حل کرنے بیٹھ ہی گیا۔ امتحان گاہ قبرستان کی طرح خاموش تھی۔ اچانک کسی نے جیسے ہزاروں لاؤڈ اسپیکر کھول دیے۔ آواز کی نکیلی لہریں خاموشی کے کچے گوشت میں سنسنانے لگیں۔ معاملہ یہ تھا کہ چوتھی قطار کے وسط میں بیٹھا ہوا لڑکا اِن وجی لیٹر کو بلا رہا تھا، جس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے وہ میز پر اپنے قلم کا سرا برابر اکھٹکھٹائے جا رہا تھا۔ جب اِن وجی لیٹر لڑکے کے پاس پہنچا تو لڑکے نے کہا، ''دیکھو، یہ ٹائم پیس میں اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔ میں نے الارم لگا دیا ہے۔ پرچا بہت آسان ہے، میں آدھے گھنٹے میں سب سوالات حل کر لوں گا۔ اور اب میں سوتا ہوں، کہ ساری رات پڑھتا رہا ہوں، اور مزید ایک لمحہ جاگتے رہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ الارم نہ بجے تو تم وقت ختم ہونے سے ٹھیک آدھا گھنٹا پہلے مجھے جگا دینا۔''

اِن و جی لیٹر نے اقرا میں گردن ہلا دی۔لڑکے نے اپنی ٹائم پیس میز پر جما دی۔اس کا ریڈیم والا ڈائل اندھیرے میں ایسے ہار کی طرح چمک رہا تھا جس کے موتی تسلسل سے نہ پروئے گئے ہوں، یا پروئے گئے ہوں تو ہر موتی کے بعد آگے کے دو تین موتی ترتیب وار غائب کر دیے گئے ہوں۔لڑکے نے کاپی اور پرچا بڑی لاپروائی سے تہ کر کے جیب میں اُڑس لیا اور مزے سے میز پر سر ڈال کر سو گیا۔پل بھر میں اس کے خراٹوں کی آواز امتحان گاہ میں شور مچانے لگی۔اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ آواز کی اس بے رحم دخل اندازی کے باوجود اِن و جی لیٹر کو کوئی اعتراض نہ تھا۔اعتراض تو دوسرے لڑکوں کو بھی نہ تھا، جیسے وہ سب، بلا استثنا، اس عبقری سے، جو نہ جانے کس کرّے سے آیا تھا، خائف تھے۔خود وہ جب داخل ہوا تھا تو اِن و جی لیٹر کا رویّہ خاصا درشت تھا۔وہ یہی سب سوچتا رہا۔پرچے پر توجہ مرتکز کرنا دوبھر ہو گیا۔اور وقت تھا کہ گزرا جا رہا تھا۔

اس کے ٹھیک بائیں جانب کوئی دو قدم کے فاصلے پر جو لڑکا تھا، وہ پہلے تو کچھ دیر تک انگلیوں سے میز کا کونا بجاتا رہا، پھر قلم اٹھا کر کاپی پر عریاں نسوانی دھڑ بنانے لگا۔کچھ دیر بعد وہ اس مصروفیت سے بے زار ہو گیا تو قلم رکھ کر اسے ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگا۔اس نے پلٹ کر جب ایک بار اس لڑکے کی طرف دیکھا تو اس نے منہ چڑا دیا، پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔اس کا جی چاہا کہ جھپٹ کر لڑکے کا منہ نوچ لے کہ دفعتاً وہی گرم، سرخ آنکھوں کی جوڑی جانے کہاں سے اس کے ذہن میں در آئی اور سیلاب کی طرح اس کے ارادے کو بہا لے گئی۔لڑکا اپنی فتح پر ایک بار پھر بڑے زور سے ہنس پڑا۔

نصف وقت گزرنے کی گھنٹی بجی مگر وہ لڑکا بیٹھا اِدھر اُدھر بغلیں جھانک رہا تھا۔گشت کرتے کرتے جب اِن و جی لیٹر اس کے پاس پہنچا تو کاپی پر جوابوں کی بجائے نسوانی دھڑ دیکھ کر بولا، ''اب تم ایسے کون سے علامہ ہو جو پرچا حل نہیں کرتے۔کچھ تو لکھ ہی دو بندۂ خدا۔کسی رحم دل ممتحن کے پلّے کاپی پڑ گئی تو شاید سطریں دو سطریں دیکھ کر ہی پاس کرنے کو بہانا مل جائے۔کچھ لکھا وکھا نہیں تو لڑھک جاؤ گے میاں۔''

''تم نرے گاؤدی ہو،'' لڑکے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔''مجھے تو خدا بھی فیل نہیں کر سکتا، سمجھے؟''

اِن و جی لیٹر مزید کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو وقت ختم ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔اچانک اسے خیال آیا: ارے وہ لڑکا تو پڑا سوتا ہے! ٹائم پیس چل رہی ہے لیکن الارم نہیں بجا۔اور اِن و جی لیٹر شاید اسے بیدار کرنا بھول گیا ہے...بھول گیا ہے یا دانستہ بیدار نہیں کیا...کون جانے؟

اس کا جی چاہا کہ اِن و جی لیٹر کو بلا کر اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلا دے مگر اس خیال سے باز رہا کہ وہ پہلے ہی اس سے بگڑا بیٹھا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ امتحان گاہ میں دیر سے داخل ہو کر وہ اپنے سارے حقوق باہر ہی چھوڑ آیا ہے۔

اس کا پرچا معمولی سا ہوا تھا اور پاس ہونے کی امید موہوم تھی...وقت ختم ہونے میں جب صرف پانچ منٹ رہ گئے تو

سوتا ہوا لڑکا یک بہ یک جمائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر پڑتے ہی وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ سارے ہال میں کہرام مچ گیا۔ لیکن سوائے اس کے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ یہ عجیب لڑکے تھے: انھیں پرچا حل کرنے کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا۔

رونے کی آواز سن کر اِن وجی لیٹر لڑکے کے پاس آیا تو لڑکے نے اضطراراً ٹائم پیس اٹھا کر پوری قوت سے اس کے منہ پر دے ماری۔ اِن وجی لیٹر کا چہرہ لہولہان ہوگیا اور گھڑی پکے فرش پر دھڑ سے جا گری۔ اس کا شیشہ چور چور ہوگیا تھا لیکن کارکردگی اب بھی جاری تھی۔ اِن وجی لیٹر لڑکے کی حالتِ زار سے دیر تک محظوظ ہوتا رہا، پھر بولا، ''بتاؤ، میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''تم کر ہی کیا سکتے ہو! تم سب نے میرے خلاف ساز باز جو کر رکھی ہے!'' لڑکے نے کہا۔ ''ہماری تمھاری دشمنی تو ازل سے چلی آ رہی ہے— ہے نا؟ خیر، میں نے بھی ریسر خرید لی ہے... دیدہ باید!''

پھر جیسے زلزلہ آ گیا ہو اور سب ہراساں باہر بھاگنے لگے ہوں۔ موت کا سائرن بجتا ہی رہا۔ ایک بار تو وہ خود اس ہنگامے سے بری طرح پریشان ہوکر کھڑا ہوگیا۔ وہ کھڑا رہا۔ بقیہ لڑکے ایک ایک کر کے چل دیے۔ سب سے پہلے جانے والوں میں آگے آگے وہ لڑکا تھا جو مسلسل تین گھنٹے تک عجیب، لایعنی حرکات کرتا رہا تھا اور جس نے کاپی پر عریاں نسوانی دھڑ بنائے تھے۔ وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور لرزتے ہاتھوں سے دونوں کاپیوں کو سفید ڈوری سے منسلک کرنے لگا۔ فرش پر پڑی ابھی تک ٹک ٹک کرتی ٹائم پیس کو بھی جیسے کچھ یاد آ گیا اور یکا یک بج اٹھی۔

اس کا پرچا یونہی سا ہوا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ اتنا کچھ لکھے گا اور اتنا مدلّل لکھے گا کہ ممتحن اس کی علمیت کے آگے گھٹنے ٹیک کر کل کے کل نمبر دے دے گا۔ پھر وہ بڑے فخر سے کہتا پھرے گا: ''خواتین وحضرات! اور یہ اس وقت کہ جب میرے ہاتھ ابھی تک کوئلے کی سیاہی سے سنے تھے!'' لیکن یا تو جو کچھ اس کے ذہن میں آتا وہ اگلے ہی لمحے بھول جاتا، یا اگر لکھنے کی کوشش کرتا تو ایک غیر مرئی طاقت اس کی انگلیوں سے الجھنے لگتی۔ وہ چپ چاپ اٹھا، کاپیاں اِن وجی لیٹر کو تھمائیں اور باہر متداخل کوریڈورز میں نکل گیا۔

ہر طرف اندھیرا تھا۔ لڑکے اِدھر اُدھر سایوں کی طرح منڈلاتے پھر رہے تھے۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہی سوال گونج رہا تھا: اگر فیل ہوگیا تو؟... وہ بھاری بھرکم آدمی دوبارہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دینے سے رہا۔ مگر وہ کم بخت آخر ہوتا کون ہے اسے منع کرنے والا؟ مارے خوف کے اسے جھرجھری آ گئی، گویا وہ بھاری بھرکم شخص اپنی جلتی آنکھوں کے ساتھ عین اس کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ تنہائی میں اس کی بابت کیسی باتیں سوچ رہا ہے— اگر کبھی اسے ان باتوں کی خبر ہوگئی تو؟ اور پھر وہ بھاری بھرکم آدمی اس قدر بھاری بھرکم ہے گویا ساری کائنات، اپنے تمام تر موجودات کے ساتھ، اس کی شخصیت ہی

سے ٹوٹ کر بنی ہے اور، اس لیے، بہ ہر نوع، اسی کی ذات کا ایک جز ہے، اور اسی لیے، بہ ہر طور، اسی کی محرم۔ رہا وہ، تو خود اس کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں۔ انفرادیت نہیں تو بھاری بھرکم شخص کی ذات کا عکس بھی تو نہیں۔

وہ اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا۔ یکا یک اسے بڑے زور کی ٹھوکر لگی۔ آن واحد میں وہ زمین پر چاروں خانے چت آ رہا۔ اگلے دو دانت زیریں ہونٹ کی قاش میں چاقو کے پھل کی طرح کھب گئے، اور زندہ خون ابل پڑا۔ دیکھتے دیکھتے ٹائلز سے بنا جگمگاتا فرش اس کے خون سے سیاہ پڑ گیا۔ اس نے پلٹ کر ٹھوکر لگنے کے محرک کو دیکھنا چاہا۔ ایک ٹائل اپنی جگہ سے ہلا ہوا تھا اور سطح سے کوئی انچ بھر ابھرا ہوا تھا۔ اسے بے اختیار محسوس ہوا کہ یہ فرش بچھانے والوں کی اس کے خلاف سازش تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ آج یہاں سے ضرور گزرے گا، اسی لیے انھوں نے ٹائل ہلا ڈالا تھا۔ اور اگر یہ سازش ان کی نہ تھی تو پھر بلا شبہ یہ حرکت اسی بھاری بھرکم آمر النّاہی کی تھی جو نیم اجالوں میں بڑی خون آشام ہنسی ہنسنے کا عادی تھا، اور جس کی آنکھیں اواخر دسمبر میں جلائی جانے والی انگیٹھیوں کی طرح وقت کے احساس سے عاری مسلسل آنچ دیتی رہتی ہیں۔

ابھی وہ اس حادثے سے پوری طرح سمجھوتا بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کی توجہ ایک تاریک سائے سے چپٹ کر رہ گئی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تیزی سے بغل میں خنجر دبائے، اس کے برابر سے گزرتا ہوا، ایک کمرے میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ وہ بلا جانے بوجھے سائے کے پیچھے ہو لیا۔

یہ تو وہی امتحان گاہ تھی۔ فرش پر اب بھی چرمرائی ٹائم پیس مسلسل ٹک ٹک کیے جا رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ بیچ کمرے میں اِن وجی لیٹر منہ کے بل پڑا تھا۔ اس کے پہلو میں خنجر گھنپا تھا اور تازہ خون کی دھار لکیر کی صورت بہ رہی تھی۔ ساری کاپیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اور بائیں طرف والے کونے میں ایک سایہ متحرک تھا۔ پھر کھڑکی کھلی اور کوئی دھم سے تیس پینتیس فٹ نشیب میں کود گیا۔ وہ تیزی سے کمرے کے باہر نکل آیا۔

٤

وہ اب تیز تیز قدم اٹھاتا دوسرے بلاک کی طرف جا رہا تھا جہاں بالائی منزل میں لڑکیوں کا امتحانی مرکز قائم کیا گیا تھا۔ اسے پیغمبروں جیسا یقین تھا کہ ان پیچ دار سیڑھیوں کے نیچے نغمہ اس کی منتظر ہوگی، یا اگر منتظر نہیں تو بس ان سے اتر ہی رہی ہوگی۔

مگر نغمہ وہاں نہیں تھی۔ یکا یک وہ اداس ہو گیا اور نہایت بے تابی سے زینے کے پاس کھڑے کھڑے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس عارضی اداسی کے باوجود، وہ دو آنکھیں، آمر النا ہی کی وہ آتشیں آنکھیں، اب اس کے شعور سے زائل ہو چکی تھیں...

ہلکی ہلکی روشنی یوں پھیل رہی تھی جیسے ابھی ابھی سورج نکلا ہو۔ دیکھتے دیکھتے اندھیرے—وہ حد کے نامہرباں، طاغوتی اندھیرے کہ جن کی شروم بے فغمہ میں وہ شانے شانے دھنس کر رہ گیا تھا— کسمسا کر، تڑپ اور لرز کر چھٹ گئے۔

عشق پیچاں کے حریف اس زینے سے اب لڑکیاں آہستہ آہستہ نیچے کی طرف گویا بہتی چلی آ رہی تھیں۔ ان کی مخروطی انگلیاں کمال سرعت سے ریلنگ کے سہارے سہارے پھسل رہی تھیں۔ دل کی بڑھتی دھڑکنوں کے درمیان اب وہ ابلقی رنگوں کے اس لہراتے جھرمٹ میں اپنا منظورِ نظر تلاش کر رہا تھا۔ اب نغمہ اترے گی...اب اترے گی۔

نغمہ کے لیے وہ کیا کچھ نہ کر سکتا تھا! جب بھی نغمہ کا خیال آیا، اس کی خوش بو آئی— گو وہ نہ آئی—ایک قوت، ایک دلیری بھی ساتھ ساتھ آئی۔ وہ اس کے لیے اس آمر الناہی کا مقابلہ بھی کر سکتا تھا۔ مگر نغمہ نغمہ تھی: کبھی آتی، کبھی اس کا خیال آتا؛ کبھی نہ آتی، اس کا خیال بھی نہ آتا، کہ اپنی مہک، اپنے خیال کی طرح وہ خود بھی بڑی وش فل تھی...اور اپنے خیال، اپنی مہک کی طرح ہوا کے ایک آوارہ جھونکے کی محتاج!

مگر نغمہ نہ اتری۔ لڑکیاں کب کی جا چکی تھیں۔ وہ بے خیال سا خیالوں میں گم تھا۔ دیر کے بعد اپنی وارفتگی سے چونکا تو دیکھا کہ پیچ دار زینے سے کاپیوں کا بنڈل تھامے ایک کریہہ صورت، ادھیڑ عمر اِن وجی لیٹر اتر رہی تھی۔ بدصورتی، سڑی گلی ناشپاتیوں سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ نہ تھی، مگر پھر اس نے اپنی یادداشت کو کھنگال ڈالنے کی کوئی جستجو نہ کی۔ نغمہ کی بابت سوچتے ہوئے وہ کسی اور کی طرف دیکھنا تک پسند نہیں کرتا تھا، کہ وہ اہم تھی...اور اس کے وجود کی تکمیل بھی۔

اِن وجی لیٹر جب اس کے بالکل پاس آ گئی تو اس نے پوچھا، ''کیا مس نغمہ ابھی تک اوپر ہی ہیں؟''

''مس نغمہ؟'' وہ بری طرح چونکی، جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ''تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر؟'' وہ بھنّائی، ''بولو کیا کام ہے؟ میں ہی نغمہ ہوں۔''

گویا آسمان گر پڑا ہو، اس کی زد سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، اور درد کے، کسمپرسی کے اس لمحے میں وہ جھونکے بھی بہک کر کسی اور طرف ہو لیے ہوں۔ نہیں، نہیں! یہ نغمہ نہیں ہو سکتی۔ یہ نغمہ کیسے ہو سکتی ہے؟ ناممکنہ! میں نغمہ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں صدیوں سے اسے دیکھتا آیا ہوں۔ پھر اسے تو کوئی بھی پہچان سکتا ہے، کہ وہ لاکھوں کے مجمعے میں بھی بنا کوشش کے آپ ہی آپ نظر آ جاتی ہے۔ شاید یہ عورت مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔ مگر لوگ مجھ سے کیوں مذاق کرتے ہیں؟ ایک مذاق وہ آمر الناہی بھی ازل سے کیے جا رہا ہے!

''معاف کیجیے گا۔ وہ تو B. Sc. کا امتحان دے رہی ہیں۔ آپ کا نام بھی نغمہ ہی ہے— عجیب اتفاق ہے، لیکن دیکھیے نا، نغمہ صاحبہ، آپ وہ نغمہ تو نہیں جس کا مجھے انتظار ہے۔'' جب ذہن پر لاعلمی اور حیرت کے ہتھوڑوں کی مار لحظہ بھر کے لیے پڑنی کم ہوئی تو اس نے کہہ ہی دیا۔

''تو حضرت، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پوری کائنات میں میرے سوا اس نام کی کوئی دوسری عورت نہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''مجھے معلوم ہے۔ مجھے بہت سی باتیں معلوم ہیں۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں کل ہی تو اس سے ملا ہوں۔ یہیں۔ بالکل یہیں۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں آپ کھڑی ہیں... اسی وقت، اسی جگہ، کل...''

''سنو،'' اچانک بے ہنگم عورت کے لہجے میں بلا کی نرمی، رازدارانہ قربت، اور بے تکلفی آ گئی۔ ''کل بھی اسی جگہ، اسی وقت تم مجھی سے ملے تھے۔ کل بھی میں نے یہی جواب دیا تھا۔ سنو، وہ جو موجود ہے اسے ٹھکرا کر سایوں کا تعاقب کرنا...''

''سایوں کا؟ نہیں، نہیں۔ میں کسی سائے کا تعاقب نہیں کر رہا۔''

''چلو سایوں کا نہ سہی، اپنے کسی الھڑ تصور کا سہی۔ مجھے دیکھو، ایک نظر دیکھو تو سہی، مجھ میں کیا کمی ہے؟''

کمی اس عورت میں واقعی کوئی نہیں تھی—اس نے سوچا—یہ سراسر زیادتی ہی تھی جو اس کے اعصاب پر گراں گزر رہی تھی۔ بعض دفعہ قدرت اپنی عطاے بسیار سے بھی اچھی بھلی صورت بگاڑ دیتی ہے: چربی کی چار تہیں آگے آٹھ پیچھے، جن میں نسوانیت کے ملائم خطوط ناقابلِ بازیافت طور پر معدوم ہوکر رہ گئے تھے۔ اور ان کے آگے ڈھب ڈھب جھولتے تربوزوں کی جوڑی نہ ہوتی، خفیف، ہمکتے ہوئے بس انگور کے دو خوشے ہوتے... نغمہ کی سوفی صد زد!

''دیکھو، سوچو مت۔'' اس نے بڑی لاپروائی سے کاپیوں کا بنڈل ہوا میں اچھال دیا۔ کاپیاں چکرا کر اِدھر اُدھر بکھر گیں۔ وہ سرعت سے اس کی طرف بڑھی۔ ''گزرے ہوئے وقت کی بازیافت کا کوئی نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ مجھے تو ان چوبیس گھنٹوں کا غم ہے جو کل اور آج کے درمیان ضائع ہوگئے ہیں۔ میں پھر کہتی ہوں، یہ سوچنے کا وقت نہیں۔'' اس نے خود کو پیش کیا: ''میرے متن میں غوطہ زن ہو جاؤ! مجھے بہت کچھ معلوم ہے...'' گویا فربہی کو لاتحاشا قوتِ گویائی مل گئی ہو۔ ''بہت کچھ۔ مجھے تو اس آمر النا ہی کی بابت بھی علم ہے۔ تم ساری عمر اس کی آنکھوں کے حصار سے نہ نکل سکو گے۔ نکلنے کی بس ایک ہی صورت ہے...''

وہ ہکّا بکّا اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا تعطل کی اس شدید کیفیت میں وہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا کہ عورت کی بلا کی ماہر انگلیوں نے اس درمیان میں کب اس کی پتلون کے بٹن کھول ڈالے تھے اور جانے کس گذشتہ لمحے، اپنے کپڑے اتارنے کی دعوت کے باوجود، یہ کام بھی خود ہی کر ڈالا تھا۔ آمر النا ہی کے ذکر پر وہ اچانک ٹھوکر کھا کر موجودہ لمحے کی ننگی، بہیمانہ حقیقت سے جھپک جھپک کر کسی قدر آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوگیا۔

''کیا صورت ہے؟''

''ایک ہی۔یہی کہ میرے ساتھ کمرے میں چلو۔''

وہ چکرا کر رہ گیا۔فربہی نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہ دیا اور عقابی پھرتی سے اس کا ہاتھ جھپٹتے ہوئے کمرے میں رینگ گئی۔پتلون کہ جس کے بٹن پہلے ہی کھل چکے تھے، جھٹکے کا بوجھ نہ سہ سکی اور ڈھب سے زمین پر آ رہی۔اس کی گھسٹتی ٹانگیں اس کے پائنچوں سے الجھ کر رہ گئیں۔کمرے کی دہلیز پر کہیں جا کر گھسٹتی چلی آتی پتلون سے نجات ملی؛ الٹی ہوئی پتلون کچھ اس طرح فرش پر ڈھیر پڑی تھی کہ ایک پائنچا کمرے کے باہر کوری ڈور میں اور دوسرا کمرے میں۔

''میں تمھیں اس سے نجات دلا سکتی ہوں،'' یہ کہتے ہوئے فربہی نے اپنے گرم گرم پستان اس کے ہاتھوں میں ٹھونس دیے اور سختی سے اس کے گریزاں جسم سے چمٹ گئی۔اس نے اپنے ہونٹ زبردستی اس کے ہونٹوں پر ثبت کر دیے تھے اور ایک نشے سے بتدریج مدہوش ہو کر لرزنے لگی تھی۔

سڑی گلی ناشپاتی سے مڈبھیڑ کا یہ تجربہ پہلا نہ سہی، یہ انداز ضرور پہلا اور اجنبی تھا۔اس کا دم گھٹنے لگا۔عورت کچے گوشت کا لوتھڑا تھی، وہ بھی کچھ ایسا جو وقت کی چھیڑ چھاڑ سے اپنا تناؤ کھو کر لٹکنے لگا ہو۔اسے یوں لگا جیسے وہ دھیرے دھیرے ایک لجلجے انبار میں دفن ہوتا جا رہا ہے۔وہ حادثے کی شدید بے ساختگی سے اس قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ اس میں مزاحمت کی ادنیٰ سی قوت بھی باقی نہ رہی تھی۔اس نے چار و ناچار خود کو عورت کے جسم کی رہنمائی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔جوہڑ کے غلیظ پانیوں میں تہ تک اتر جانے کا وہ احساس بڑا بوجھل تھا۔اسے بڑے زور کی ابکائی آئی۔پھر ابکائیاں آتی ہی چلی گئیں، مگر اس نے خود کو انھیں لتھڑی لتھڑی گہرائیوں میں پڑے رہنے دیا۔جوہڑ سے خود کو باہر کھینچ نکالنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہی تھی— کہ یہ سفر تو ایک جہنم سے دوسری اور زیادہ شدید جہنم کی طرف تھا؛ کہ غلیظ پانیوں سے نکل کر سامنا ان کناروں سے ہوتا جو کیچڑ سے چپڑی لتھڑی خودرو گھاس کی وسعتوں میں اپنے خط و خال ہی کھو بیٹھے تھے۔گویا وہ اپنے مادّی وجود کے ایک بے حد جان دار حصے سے گریزاں ہو گیا ہو، تاہم یہ حصہ اس کے جسم سے جونک کی طرح وابستہ ہی رہا۔

عورت اس کے جسم سے حسب منشا کھیل کھال کر دیر سے ٹھنڈی ہوئی پڑی تھی، اور اب اس کے پہلو میں یوں ہی پڑی پڑی عجیب سرور آمیز طمانیت سے اونگھنے لگی تھی۔اسے اگر کچھ احساس تھا تو یہی کہ وہ دیر ہوئی مر چکا ہے؛ اس کی لاش جوہڑ کے غلیظ پانیوں میں پڑی ہے؛ اور فضا میں یہ کافور کی مہک نہ تھی بل کہ پسیجی ہوئی دارچینی کی بو تھی— دماغ کے خلیوں کو جھنجھنا دینے والی بو۔

آخر اس نے خود کو گھسیٹ کر جونک سے الگ کیا، بے بسی کے ساتھ کپڑے پہنے، اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اندھیرے پھر اُمڈ آئے۔یہ نغمہ تھی؟ نغمہ یا غریمۂ نغمہ؟ نغمہ، نغمہ...وہ عورت یقیناً جھوٹ بول رہی تھی۔ابھی کل ہی تو وہ نغمہ سے ملا ہے۔''اوہ،'' اس کا دماغ کسی اور طرف چل دیا۔''آہ، شاید آج اس کا پرچا ہی نہ ہو...''

اس کا ذہنی خلفشار تو کسی قدر کم ہو گیا لیکن جوہڑ کے غلیظ پانیوں سے بچتے سے کا یہ تجربہ اس کے قلبی اضطراب کو مسلسل مہمیز کیے جا رہا تھا۔

۵

سرخ رنگ کی دو منزلہ بس کھڑی تھی۔ وہ اندر رینگ گیا۔ بس دیر سے کھچا کھچ بھری تھی مگر ہلنے کو تیار نہ تھی۔ اسے بے حد غصہ آیا۔ بلا کی گرمی تھی۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا بے اختیارانہ چیخ پڑے۔

آخر یہ چلتی کیوں نہیں؟ اسے کس کا انتظار ہے؟ اب اور کون آنے والا ہے؟ میں آ تو گیا ہوں!

بس چل کر نہ دی۔ تنگ آ کر اس نے انتظار ہی چھوڑ دیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ چلے کیسے، ڈرائیور اور کنڈکٹر دونوں ہی غائب ہیں۔ کیا مصیبت ہے۔ کہاں مر گئے ہیں؟ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کتنی؟ پتا نہیں۔ لیکن یقیناً بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب تک تو انھیں آ جانا چاہیے تھا۔ وہ مرحوم ان وجی لیٹر بے کار ہی زور جما رہا تھا کہ زندہ قوموں کی نظر ہمیشہ اپنی گھڑی پر ہوتی ہے۔ یہ کیسی زندہ قوم ہے اس کی نظر تو شراب کے گھڑے پر ثبت ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید—

اسے حیرت کچھ اور بھی زیادہ یوں ہو رہی تھی کہ اس ٹھسا ٹھس بھری بس میں اس کے سوا سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر مطمئن بیٹھے تھے۔ گرمی سے گویہ سب کمر کمر پسینے میں غرق تھے لیکن بہ ظاہر انھیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ تم سب سالو اور سالیو انسان نہیں ہو! دور، دور تک— اس کا جی چاہا کہ دے مگر جوں ہی اس کی نظر باہر اندھیرے میں گئی، وہ سب بھول بھال کر اُدھر ہی دیکھنے لگا۔ دو لونڈے تھے جو گیند بلاّ کھیل رہے تھے۔ ایک بار گیند بالکل اس کی کھڑکی کے نیچے آ پڑی اور پیچھے پیچھے ایک لونڈا دوڑا آیا۔ ''سنو!'' اس نے لڑکے کو مخاطب کیا مگر وہ سنی اَن سنی کر گیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے لڑکے کو رام کرنے کی ترکیب سوچ لی تھی۔ جھٹ چاکلیٹ کی ایک بار جیب سے نکال کر لڑکے کی طرف نچا نچا کر کہنے لگا، ''چاکلیٹ کھاؤ گے؟''

لڑکا گیند بھول بھال گیا اور للچائی ہوئی نظروں سے چاکلیٹ کو گھورنے لگا۔ دو چار لمحے انتظار کیا، پھر بڑے اکھڑ پن سے بولا، ''سالے اب دے بھی چکو، تمھاری ماں...''

''دیکھو، تم میری ماں کے بارے میں یہ واہی تباہی باتیں نہ کرو۔ تم نے اسے دیکھا تک نہیں ہے۔''

لڑکا خجل سا ہوا، مگر اگلے ہی لمحے اس کی معصومیت جاتی رہی۔ اس نے اپنے عادی اکھڑ پن سے کہا، ''سالے تم چاکلیٹ دکھا دکھا کر للچائے جا رہے ہو؟ یہ کوئی شرافت ہے۔ دے بھی چکو نا۔''

''پہلے یہ بتاؤ کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کہاں ہیں۔''

''ارے وہ— وہ وہاں رہے،'' لڑکے نے اشارہ کیا، دور۔'' وہاں ملباری کی جھگّی میں پتّے کھیل رہے ہیں۔ اب چاکلیٹ دو۔''

''سنو،'' اس نے چاکلیٹ باہر لڑکے کی طرف اچھالتے ہوئے، تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے، بڑی رازداری سے کہا، ''جا کر انھیں بلا لاؤ۔ کہنا دیر ہو رہی ہے، آ کر بس چلائیں۔''

''اچھا سالے، تم بھی کیا یاد کرو گے،'' لڑکے نے فیّاضی سے کہا، اور آناً فاناً بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے ایک سرسری سی نظر اندر بس میں ڈالی۔ لگا جیسے تمام لڑکے لڑکیاں اس سے اپنا رہا سہا تعلق بھی ختم کر چکے ہوں۔ گو کہا کسی نے بھی کچھ نہیں، مگر چہروں سے ایک ہی تاثر مترشح تھا— ناپسندیدگی کا بڑا واضح تاثر، گویا وہ اس کی اس حرکت سے سخت بدظن ہوں۔

جلد ہی لڑکا لوٹ آیا اور بولا،'' ڈرائیور نے کہا ہے کہ بابو سے کہنا تمھاری ماں کی...کوئی دھونس ہے۔ نہیں چلاتے۔ پتّے کھیل رہے ہیں۔ بنے سو کر لو۔''

وہ بے زار اداسی سے پھر اندھیرے میں گھورنے لگا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کب ڈرائیور اور کنڈکٹر لوٹ کر آئے اور کب بس چل پڑی...

جلد ہی بس یونی ورسٹی کی حدود عبور کر کے کھلی سڑک پر نکل آئی۔ اب وہ بڑی برق رفتاری سے سیاہ سڑک پر پھسل رہی تھی۔ اندر ایک طرف کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں اور باقی حصے میں لڑکے کاٹھ کباڑ کی طرح تلے اوپر ٹھنسے تھے۔ ان میں سے کچھ اخبار پڑھ رہے تھے، کچھ کتابیں، کچھ اپنی سوچ میں گم تھے، اور باقی جو یہ سب نہ کر رہے تھے، بالکل چپ بیٹھے تھا۔ لڑکیوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی: پڑھ رہی تھیں، بُن رہی تھیں، یا بالکل خاموش تھیں۔ یہ بات اسے بہت کھلی کہ کوئی کسی سے بات کرنے کا روادار نہ تھا، جیسے آپس میں کوئی شناسائی نہ ہو، وہ ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہوں۔ موت کا سنّاٹا، ایک سنسناتا ہوا سکوت بس کی محدود فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ اگر زندگی کا احساس کسی چیز سے قائم تھا تو یہ بس کی غیر انسانی گھڑگھڑاہٹ تھی یا پھر وہ کم بخت شیشہ تھا جو ٹھیک اس کے کان کے پاس بنا لمحہ بھر کو رکے دھڑ دھڑائے جا رہا تھا شاید وہ اپنے چوکھٹے میں مضبوطی سے جمایا نہیں گیا تھا۔ اس مسلسل دھڑ دھڑاہٹ سے اس کا سارا وجود کانپ گیا، اور چنگاریاں دماغ میں وحشت ناک رقص کرنے لگیں۔ بس اور شیشے کی آواز اتنی مسلسل تھی گویا خاموشی کا جز بن چکی تھی۔ اس بوجھل یکسانیت سے اس کے ریشے ریشے میں مجہولیت اور خالی پن کی ایک لہر سرسرا کر رہ گئی۔

یہ کس قسم کی مخلوق تھی؟ گفت گو کرنے کے لیے کیا ان کے پاس کوئی موضوع نہیں باقی بچا تھا؟ کچھ نہیں تو آج کے پرچے کی بابت ہی اظہارِ خیال کر سکتے ہیں! یہ کیسی بے حسی ہے؟ کیسا مرگ؟

اب بس کی کوئی رفتار نہ تھی۔ رہی بھی ہو تو کم از کم انسانی ذہن اس کے ادراک سے قطعی عاجز تھا— کہ وہ تیز رفتاری کی تمام ممکنہ محسوس حدود پھلانگ کر رفتار کے اس دائرے میں آ گئی تھی جہاں رفتار کا تصور ہی زائل ہو جاتا ہے۔ وقت— جس کو ناپنے کے تمام انسانی آلے اور تصورات پیچھے دنیا میں رہ گئے تھے— پہلی بار، سب سے پہلی بار، اپنے سے خوش، ورائے نفس سب سے خوش، سکون سے اپنی اٹھان میں، دوڑ اور مسابقت کے احساس سے عاری، بہے جا رہا تھا: سبک رو، تیز رو، نارو۔

بس رک کر نہ دی۔ اندر بڑا دبیز دھواں بھرا تھا، اس پر ڈیزل کی چبھتی ہوئی بو مستزاد۔ سانس لینا تک ایک مرحلہ تھا۔ عجیب سا گھمس۔ نامعلوم گھٹن۔ اسے اتنی وحشت ہوئی کہ جی چاہا فوراً باہر چھلانگ لگا دے، بھرپور قوت سے پھیپھڑوں میں مقید مسموم ہوا کو خارج کر دے، لیکن اَن جانی منزل کی طرف بھاگتی ہوئی بس کی رفتار... پھر موت تو اندر بھی تھی اور باہر بھی۔ فرق تھا تو آخری سانس کے وقفے کا، جاتے دم کے لمحے دو لمحے التوا کا۔ اس کا سر شدت سے چکرانے لگا۔ لیکن اس عذاب سے زیادہ تکلیف تو ان لوگوں کی خاموشی سے ہو رہی تھی۔ مہر بہ لب یوں مطمئن بیٹھے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، درست ہو رہا ہے۔ انھیں نہ اس ٹھاٹھیں مارتے بحرِ ظلمات سے وحشت ہو رہی تھی، نہ اس دم کش دھویں اور گھٹن سے۔ زندگی میں آخر انھیں کون سی چیز اتنی جاذب نظر آ گئی تھی کہ جس کے لیے انھوں نے موجودہ صورت حال سے مفاہمت کر لی تھی؟ نہ زبان پر حرف احتجاج، نہ چہرے پر بے اطمینانی کا کوئی دھندلا سا بھی عکس۔ پھر یہ لڑکیاں تھیں جو لڑکیاں ہوتے ہوئے بھی چپ تھیں۔ اور ایک کم بخت یہ شیشہ تھا جو مسلسل کان کے پاس دھڑ دھڑائے جا رہا تھا، جس کی وجہ سے اس کی نس نس میں تیز، شش جہتی نکیلی لہریں سنسنا رہی تھیں۔ یہ لوگ کیسے تھے؟ کچے سیب کی طرح سپاٹ چہرے، اور اگر کوئی تاثر اطمینان منڈھے پردوں کو خفیف سا سرکا تا جھلک آیا تھا تو یہ ایک نامعلوم خوف کا تاثر تھا۔ کیا خوف تھا یہ؟ کس کا خوف؟ انھیں کچھ سوچنے کی حاجت نہ تھی۔ اس مسموم زندگی سے آخر انھوں نے کیوں سمجھوتا کر لیا تھا؟ پھر یہ اختیاراً کیا تھا یا اضطراراً؟ یا پنی کسی کم زوری کی وجہ سے یا ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یوں نہیں تو پھر کس طرح؟ بس سے دست بردار ہونا زندگی سے کنارہ کشی کرنے کے مساوی تھا، جو پہلے ہی کون سی اختیاری بات تھی۔ بس اپنی تیز رفتاری کے سبب کسی لمحے بھی الٹ سکتی تھی: پھر لوگ برسوں بڑے بڑے محدّب شیشے لے کر ان کے ریزوں کی تلاش کرتے پھریں گے جو سرمہ ہو کر، حقیر اور بارک ہو کر خاک کا جزو لاینفک بن چکے ہوں گے۔

اس نے بے زار ہو کر جماہی لی۔ چپ بیٹھنا اس کے لیے دوبھر ہو چلا تھا۔ تنہائی کے اس عذاب کو آخر کسی نہ کسی طرح زائل تو کیا ہی جائے، کسی سے باتیں کی جائیں، کچھ سنا کچھ سنایا جائے، شکوے شکایات ہوں، لڑائی جھگڑا ہو— کچھ تو ہو۔ لیکن اتنے بہت سے لوگوں میں کسی کا رویّہ دوستانہ نظر نہ آیا جو وہ اسے غنیمت جان کر گفت گو کا آغاز کرتا۔ الجھن، کم علمی، اور مجہولیت نے مل جل کر اس کے وجود میں ایسے اضطراب کو جنم دیا جو اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔

اس نے تھک کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ دبیز اندھیرے نے اس کی بے بسی کو جھنجھلاہٹ تک پہنچا دیا اور کسی سے بھڑ

جانے کی خواہش سے مغلوب ہوکر اس نے اپنے ہم نشیں سے پوچھا:

''یہ بس کہاں جارہی ہے؟''

سنسان رات میں اس کے لفظوں کی بازگشت جھن جھنا کر رہ گئی۔ سکوت کا ادنیٰ سے ادنیٰ گوشہ بھی اس بازگشت سے لب ریز ہوکر چھلک اٹھا۔ وہ اپنے تقریباً زیرِلب لفظوں کی اس ناقابلِ یقین بلند بانگی پر ہانپ کر رہ گیا۔

ہم نشیں نے جواب دیا نہ اس کی طرف دیکھا، بس ناگواری کا ایک بڑا واضح تاثر اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ اس نے گھبرا کر ایک چھچلتی سی نظر مسافروں کے چہروں پر ڈالی تو وہ سب اسے نہایت تنفّر اور حقارت سے گھورتے نظر آئے۔ اتنی وافر حقارت کے ہجوم میں سب سے پہلا احساس جو اسے ہوا وہ یہ تھا: وہ ان سب کا مجرم ہے۔ اَن جانے میں کوئی نہایت قبیح فعل اس سے سرزد ہوگیا ہے جس کی تلافی وہ تمام عمر نہ کر سکے گا۔ اس کی ہمت نہ پڑی کہ اپنے ہم نشیں کو مخاطب کر کے پھر اسی جرم کا اعادہ کرے جو کر یہہ تھا اور تخاطب سے وابستہ۔

اور وہ کم بخت شیشہ ٹھیک اس کے کان کے پاس مسلسل دھڑ دھڑائے جارہا تھا۔ اب اس کی آواز ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے کسی نے بہت باریک پسا ہوا کانچ اس کی شریانوں میں داخل کر دیا ہو، اور خون کی گردش نے اسے سارے جسم میں پھیلا دیا ہو اور اب وہ اس کے گوشت کے ہر ہر ریشے میں کھب رہا ہو۔

اس نے جھلا کر بھرپور قوت سے شیشے پر گھونس دے مارا— کہیں دور کانچ کے بکھرنے کی آواز گونجی، جس کی تال پر ایک برفیلا پھل اس کے چہرے کو آر پار کاٹتا چلا گیا۔ دھڑ دھڑاہٹ سے سکون مل چکا تھا، لیکن اب خالی چوکھٹے سے آتی ہوئی یخ ہوا اس کے چہرے کو سرد کیے دے رہی تھی۔ اس نے پریشان ہوکر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ بیسیوں خیالات اس کے ذہن میں ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے: آخر یہ بس جا کہاں رہی ہے؟ یہ وقت کیوں آج خود اپنے ہی احساس سے عاری شیشم کی چھاؤں میں سو گیا ہے؟ یہ بس کہیں ٹھہرتی کیوں نہیں؟

باہر گھپ اندھیرا تھا اور اس کی نظریں تاریک پیکروں سے الجھ رہی تھیں۔ اب کی بار اس نے اندھیروں سے نظریں نہیں چرائیں بل کہ انھیں گھورنا شروع کر دیا۔ وہ کم بخت شیشہ جانے کہاں سے آکر پھر چوکھٹے میں جڑ گیا تھا لیکن اس کی دھڑ دھڑاہٹ کم نہ ہوئی تھی، بل کہ اب ایک دہری مصیبت تھی: ایک آواز اور پھر ہوا— شیشے کی اوٹ کے باوجود ہوا کی برفانی لہریں اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ مگر وہ باہر دیکھتا ہی رہا۔ بس کے اندر ماحول اس کی شکست اور جرم کا غمّاز تھا؛ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے روشنی کی ایک باریک سی لکیر دکھائی دی جو سیاہ سڑک کے متوازی چل رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ ہوکر روشنی کی اس باریک دھار کو دیکھنے لگا جو اب خود ایک مختصر سے پاٹ کی سڑک معلوم ہورہی تھی۔ معاً ایک تیزی سے گردش کرتا ہوا بگولا عقب سے نمودار ہوا اور اس نورانی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اگرچہ بس کی رفتار، رفتار کے تعیّن سے ماورا

تھی، تاہم بگولا اگر اس سے آگے نہیں نکل رہا تھا تو کم از کم اس کے برابر ضرور بھاگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بگولے کی طرف دیکھا: دھند اور سیاہی کا غبار چھٹنے لگا۔ اسے دکھائی دیا کہ پتلی سی نورانی پٹی پر یہ کوئی بگولا نہیں دوڑ رہا ہے، بل کہ یہ تو کوئی شخص ہے جو بغیر گدّی کی ریس لگانی والی سائیکل پر اپنی پوری قوت سے دونوں ہاتھ چھوڑے پیڈل مار رہا ہے، اور بہ ہر قیمت بس سے آگے نکل جانے پر مصر نظر آتا ہے، اور بس کی رفتار، رفتار کے تعیّن سے ماورا ہے، اور پھر اس کم بخت کو کس حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ اپنی فاضل شکر کو جلانے کا بس یہی ایک طریقہ ہے، اور اگر ہے بھی تو بھلے مانس بغیر گدی کی سائیکل پر دونوں ہاتھ چھوڑ کر پیڈل مارنے کی یہ کیا تک ہے۔ تک ہو نہ ہو، یہ مفت کا تماشا ضرور تھا۔ اور وہ دوسروں کی موجودگی سے بے خبر سائیکل سوار کی دیوانگی پر ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگا۔ ''کم بخت، سالے تم خوب ہو!'' اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ اب وہ بڑے تجسس، اور اتنے ہی شدید اشتیاق سے سائیکل سوار اور بس کی دوڑ دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ احمق سر دھڑ کی بازی لگا کر نکلا تھا۔

بس اور سائیکل سوار کی دوڑ کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں تبدیل ہوگئی— یوں جیسے ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی اس سڑک پر یہ دوڑ جاری ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص نے بھی پسپا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہو۔ مشقت کی شدت سے اب اس کا وجود اپنا سارا آب و رس کھو چکا تھا، لیکن اس کے سوکھے چرخ پانو— ان میں جانے کیسی سیمابی حرکت اور صدیوں کی جلن تھی!

وہ دیکھتا رہا۔ خالص تفریح کا وہ اولین احساس اب بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا اور وہ سوار کی جانب سے فکر مند ہو چلا تھا۔ سوار کی موت حتمی تھی۔ اور اب تو اس دیوانے نے بڑے قطعی طور پر اپنی بچی کھچی طاقت جمع کر کے بس سے آگے نکل جانے کی ایک آخری کوشش بھی کر ڈالی تھی۔ اب وہ یا تو بے دم ہو کر گر پڑنے کے قریب تھا یا بس سے آگے نکل جانے کے—

وہ بس کے وسط سے اگلے حصے تک رفتار کو شکست دے ہی گیا، اور اب بس سے آگے نکلنے ہی والا تھا کہ... ایک طرف بس ایک دھماکے کے ساتھ ٹھہر گئی، اندر بیٹھے مسافروں کے سر جانے کن کن چیزوں سے ٹکرا کر لہولہان ہو گئے اور بس کے حق میں، جو یک لخت بریک لگنے سے تھمی تھی، رفتار کی یہ موت بڑی ہیجان پرور ثابت ہوئی: بس کا پچھلا حصہ آسمان تک بلند ہوا اور لڑکیاں پکے آموں کی طرح دھڑ دھڑ اگلے حصے میں بیٹھے لڑکوں کے سروں پر ٹپکنے لگیں۔ اور دوسری طرف وہ سوار بریک لگاتے ہی سائیکل سمیت اَن گنت قلابازیاں کھاتا چلا گیا۔ اس کا سر چپٹا گیا تھا— اور یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ سامنے کرا سنگ تھا جہاں بنا کسی تمہید کے سرخ بتی نے سبز بتی کو نگل لیا تھا، جان بوجھ کے— اسے لگا— کیوں کہ وہ بس کی شکست نہیں چاہتی تھی۔

بس رکی تو اس کا جی چاہا کہ چھلانگ لگا کر باہر بھاگ نکلے اور پیچھے مڑ کر دیکھے کہ وہ اپنی دنیا سے، دلوں کی ہمسائگی کے احساس سے عاری، آمرالناہی کی دنیا سے کتنے اربوں میل آگے نکل آیا ہے۔ اندر بڑی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ابھی وہ بہ

مشکل دروازے تک پہنچا پایا تھا کہ بس چل پڑی۔ اور پھر وہی رفتار! وہ مایوس سا اپنی نشست کی طرف لوٹا مگر اس کے ہم نشیں نے اس کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ چناں چہ وہ ہینڈل پکڑ کے کھڑا ہو گیا، اور گردن موڑ کر سائیکل سوار کا انجام دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا وہ اپنی شکست تسلیم کر چکا ہوگا۔ مگر یہ صرف اس کا واہمہ ہی تھا: وہ جگمگاتی پٹی، جو قوتِ ارادی کے بل پر فروزاں تھی، جوں کی توں موجود تھی، اور اگر چپٹا گیا تو کیا ہوا، سوار نے پھر دوڑ لگانی شروع کر دی تھی۔

''احمق—''

وقت اپنے احساس سے عاری اپنے نواسوں نواسیوں کے ساتھ انگور کی بیلوں سے لدی مہتابیوں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ جانے کب تک دوڑ جاری رہی۔ اس نے دیکھا کہ اس نورانی پٹی پر اچانک کہیں سے کیلے کا ایک چھلکا آ گرا اور اپنی ہی حرت کے بل پر تیزی سے اس پر پھسلنے لگا۔ چھلکا سوار کو اپنی زد میں لینے کے درپے تھا، اور سوار، جو اپنی جگہ کچھ کم مشّاق نہ تھا، برابر اس کی زد سے بچتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن اس تگ و دو کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کی توجہ بس سے ہٹ کر اب مکملاً چھلکے پر مرکوز ہو گئی تھی۔ چناں چہ وہ رفتار پر قابو نہ رکھ سکا اور بس سے کوئی دو گز پیچھے رہ گیا۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دیوانہ وار پیڈل مارنے لگا۔ اب اسے نہ چھلکے کا کوئی غم تھا نہ اپنی جان کا، کہ اگر ایک بار، صرف ایک بار وہ بس سے آگے نکل جائے۔ وہ بس کے اگلے حصے تک آ گیا تھا اور بس اس سے آگے نکلنے ہی والا تھا کہ... جیسے بڑے زور کی بجلی کڑکی، آتش فشاں پھٹ پڑا، آسمان روئی کی طرح دھنک کر رہ گیا، اور ٹوٹے ستاروں کی گرد چاروں طرف بکھرنے لگی۔ وہ نورانی پٹی غائب ہو چکی تھی، کیلے کے چھلکے کی زد میں آ کر سائیکل کا پہیا رپٹ چکا تھا، اور سوار بس کے ایک پچھلے پہیے کے عین نیچے۔ جہاں سوز قہقہے کی گونج فضا میں بکھری ہوئی تھی، سڑک کے خط و خال سرخ دھوئیں میں تبدیل ہو رہے تھے لیکن بس پھر بھی رک کر نہ دی۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ اضطراراً بلند ہوئی:

''روکو، بس روکو— خدارا! وہ مر گیا۔ وہ، وہ جو آگے نکل جانا چاہتا تھا، وہ بس کے پچھلے پہیے کی زد میں آ کر... روکو! بس روکو!''

بس نہ رکی۔ اندر مسافروں نے بڑی حقارت سے ناک بھوں چڑھائے۔ وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا: ٹھیک ہے، وہ احمق ہی تھا جو خود ہی خود بس سے دوڑ لگا رہا تھا۔ یقیناً اس میں ڈرائیور بے قصور ہے۔ وہ لڑکا دیوانہ تھا۔ خود ہی دوڑ لگا رہا تھا۔ اسی لیے مارا گیا—

لیکن جب بس کسی طرح رک کر نہ دی تو اسے ڈرائیور کی معصومیت پر کچھ شک سا ہوا۔ ممکن ہے یہ اسی کی تحریک تھی جس نے مقابلے کی دوڑ کو جنم دیا تھا، ممکن ہے یہ اسی کی سازش رہی ہو۔ اسی لیے وہ مر گیا، ورنہ وہ تو بلا کا مشاق تھا، گرچہ بے وقوف بھی۔ بایں ہمہ، کیا انسانی جان کی اتنی وقعت بھی نہیں کہ بس چند لمحوں کے لیے ہی ٹھہر کر اس کی جواں مرگی کا ماتم کرتے ہوئے

آگے بڑھ جائے؟

مسافروں کو اس کو موجودگی کھلنے لگی۔ وہ ان کے سکون میں خلل انداز ہوا تھا۔ وہ مجرم تھا۔ انھوں نے چند لمحے کچھ سوچا، پھر بہ یک زبان فیصلہ سنا دیا: ''اس نابکار کو اتارو!''

ایک گہری پریشانی ان کے سکوت کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی سامنے آ گئی تھی۔ یہ کیا پریشانی تھی؟

''اتارو اس ناہنجار کو۔ ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ بد بخت ہمیں وہاں لے جا کر مارے گا جہاں آس پاس کوسوں دور پانی کی ایک بوند نہ ہوگی۔''

کنڈکٹر گہری فکر میں ڈوب گیا۔ کیا مسافروں کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی؟ اس نے ہولے سے گردن ہلائی اور ڈرائیور کو بس روکنے کی ہدایت کی۔

بس ٹھہرتے ٹھہرتے بھی کئی زمانوں سے آگے نکل گئی۔ خدشات نے اسے آ لیا۔ بس رکی تو کنڈکٹر نے پاس آ کر کہا، ''چلیے مسٹر، یہاں آپ کو اترنا ہے!''

''کیوں؟ میں نہیں اتروں گا۔''

''اترنا ہی پڑے گا! کیوں کا جواب میرے پاس نہیں۔''

''مگر یہ میری منزل نہیں۔''

''کسی کی کوئی منزل نہیں ہوتی،'' کنڈکٹر اطمینان سے بولا۔ ''ہر کوئی راستے کے بیچ خود اتر جاتا ہے، یا اتار دیا جاتا ہے۔ آپ خود اترنے کے لیے آمادہ نہیں تو ہم ہی یہ فریضہ انجام دیے دیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر کنڈکٹر نے اسے دبوچ لیا اور گھسیٹتا ہوا دروازے تک لایا۔ اس نے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی لیکن جلد ہی بے دم ہو گیا۔

اگر میں نے — اس نے سوچا — خواب دیکھنے کے علاوہ کبھی کبھار اسی جوش و خروش سے ورزش بھی کر لی ہوتی، یہی کوئی سو پچاس ڈنڑ یومیہ لگا لیے ہوتے، تو آج خوب کام آتے۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے...

دروازے کے نزدیک بیٹھی لڑکیوں کو دیکھ راس کی ڈھارس بندھی: شاید لڑکیاں — جو عموماً رحم دل ہوتی ہیں — اس غیر انسانی رویّے پر احتجاج کریں اور اسے اَن جانی راہوں پر اتار دیے جانے سے بچا لیں۔ اس نے بڑی پُر امید نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے رحم کی اپیل کی۔ لیکن لڑکیوں کے چہرے پر سختی تھی اور ان کے جبڑے مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے، گویا کسی نامانوس جذبے کو دبا رکھنے میں انھیں دقت پیش آ رہی ہو۔ انھوں نے آنکھیں چار ہونے سے پہلے ہی منہ موڑ لیے۔ کنڈکٹر نے بلا کسی کوشش کے ربڑ کی گیند کی طرح اسے اچھال کر باہر فضا میں پھینک دیا جہاں سے وہ سڑک پر آ رہا اور کئی

فرلانگ تک گدّے کھاتا چلا گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو بس کب کی جا چکی تھی اور سڑک، تا حدِ نگاہ، تاریکی میں شرابور اس کے سامنے پڑی تھی۔

٦

وہ کچھ دیر تک سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا رہا: کس طرف جائے؟ ماؤف—وہ سڑک پر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ ذہن میں بس یہی ایک خیال تھا: اس دیوانے کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ چل کر دیکھنا چاہیے۔ وہ یکا یک اپنی پوری قوت سے دوڑنے لگا۔

میں پولیس تھانے جا کر اس واقعے کی تفصیلی رپورٹ درج کراؤں گا۔ اب کچھ کچھ بس کا نمبر بھی اسے یاد آنے لگا تھا۔ ڈرائیور کی بربریت نے اس کی نس نس میں آتش گیر مادہ بھر دیا تھا اور مسافروں کی بے نیازی نے اس کی حیرت دوچند کر دی تھی۔ اب وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پوری قوت سے سڑک کے سیاہ فیتے پر پیچھے کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

بڑی دیر کے بعد وہ ہانپتا ہانپتا ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا جہاں سوار اور موت کا سنجوگ ہوا تھا۔ سائیکل کا ہر ہر پرزہ اپنی اصلی وضع قطع چھوڑ چکا تھا اور سوار کا ٹوٹا پھوٹا جسم سڑک کے عین وسط میں بکھرا پڑا تھا۔ بدہیئتی کا شاہکار تو اس کی کھوپڑی تھی جس میں دورانِ حیات کیسے کیسے مجنونانہ خیالات آیا کرتے تھے۔ بھیجا سڑک پر لپا پڑا تھا: گاڑھا گاڑھا لیپ کہ جس میں اب زمانوں کے مہجور، مقبوض کیڑے بجبجاتے ہوئے آزادانہ اپنی اپنی راہ جا رہے تھے۔ خون بَہ بَہ کر جم چکا تھا، اور ہلکا سرخی مائل دھواں—جس میں زندہ گوشت کے جلنے کی چراند تھی—ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

سالے تم تو مزے سے مر مرا گئے لیکن میری روح کو اس مہمل فرض سے گراں بار کر گئے...جانے تھانا کہاں ہے؟ کہاں ہو؟

اس نے اپنے گردوپیش پر ایک ٹٹولتی ہوئی نظر ڈالی۔ جہاں یہ حادثہ ہوا تھا، وہیں سڑک کے کنارے ایک بورڈ لگا ہوا تھا، جس کے پیچھے ایک طویل و عریض احاطہ تھا۔ پہلی نظر میں وہ بورڈ پر درج الفاظ نہ پڑھ سکا۔ جب زور دے کر پڑھنے کی کوشش کی تو ''تھانا'' رقم نظر آیا۔ اسے ایک گونہ تسلّی ہوئی اور وہ تیز تیز قدموں سے احاطے کی طرف بڑھنے لگا۔

میل بھر کا چکر کاٹ کر جب وہ احاطے کے آہنی پھاٹک پر پہنچا تو وہ کھلا پڑا تھا۔ وہ دبے قدموں سے اندر رینگ گیا۔ طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات نے اس کے دل پر یورش کر دی۔ اسے لگا وہ خود اپنی موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ کیوں نہ لوٹ جاؤں؟ مگر واپسی ناممکن تھی: اس اَتھاہ خاموشی میں اس کے سامنے ہزاروں کمروں والی وہ عمارت اپنے طول و عرض سمیت نہایت متکبرانہ شان سے سر اٹھائے کھڑی اسے اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی۔

وہ رازوں کی اس سرزمین میں آگے بڑھتا گیا: تنہا، لاچار، بے دل، سرفروش۔

ان ہزاروں کمروں میں گھنٹوں چکراتے پھرنے کے باوجود اسے کہیں ایک متنفس بھی نہ ملا۔ یہ عجیب تھانا تھا: یہاں صرف وسعت تھی، ویرانی اور اندھیروں کی آہٹیں تھیں۔

ایک کمرے سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں... یہ خالی تھے لیکن ان میں ایک چیز ضرور مشترک تھی: دیوار سے ٹنگی وہ قد آدم تصویر جس کے گرد گلاب کے ہار پڑے تھے! مگر وہ اپنی کھوج میں ایسا غرق تھا کہ تصویر کی طرف توجہ ہی نہ گئی۔ جب وہ بے حد تھک گیا تو الٹا پھرا۔ مگر کمروں کا یہ سفر بھول بھلیوں سے کم ثابت نہ ہوا۔ وہ دیر تک عمارت سے باہر نکلنے کی جستجو میں اندھے کمروں میں ٹامک ٹوئیے مارتا رہا تا آں کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ جب تکان سے اس کے قدم شل ہو گئے اور وہ ایک کمرے کے بیچ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

اسے محسوس ہوا کہ تکان کے علاوہ اسے شدید پیاس بھی لگ رہی ہے۔ مجھے پیاس لگی ہے! مجھے پیاس لگی ہے، نغمہ۔ مجھے پانی دو۔

سنا تم نے نغمہ، چند گھنٹوں کے پیاسے کو بھی پینے — نہیں، چوسنے — کے لیے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ ایک میں ہوں: خواہش کی پیاس میں جنم جنم سے سوزاں — مجھے دو گھونٹ پانی بھی نہ دو گی؟ دیکھو، بس ایک نظر دیکھ لو نغمہ: یہ میرے پانو ہیں، دیکھو، صحراؤں کی ریت نے انھیں کس طرح جلا ڈالا ہے، اور یہ، یہ کیچڑ، راستے میں گندے پانیوں کا جوہڑ بھی پڑتا تھا جس نے میری روح تک کو اپنے گاڑھے متعفن عذاب سے آلودہ کر دیا ہے، میرے پانو، صحرا، جوہڑ... آرزوے خستہ کے رنجیدہ پانو، آرزوے خستہ کے لرزیدہ پانو، آرزوے خستہ کے شب دیدہ پانو، آرزوے خستہ کے دزدیدہ پانو، آرزوے خستہ کے کم دیدہ پانو، چیدہ پانو، بریدہ پانو، ترسیدہ پانو، برمیدہ پانو، برگزیدہ پانو، آرزوے شردیدہ کے رم دیدہ پانو، پانو، پانو، پانو، گیسوے تاب دار کو اور بھی پاے دار کر، اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر نکلے، اِدھر ڈوبے، ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا، تراشے ہے پناہیں، تراشے ہے پناہیں، کون سی پناہیں؟ دیر و حرم؟ میں تمھیں چومنے بیٹھوں تو تم میں اتر جاؤں، جانے دو تم پانی دو، افسانے ہیں جو لوگ بکا کرتے ہیں...

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو نظر تصویر پر جا پڑی۔ ''یا خدا!'' وہ تحیر اور درد سے چیخ اٹھا۔ ''جاتا ہوں، جاتا ہوں۔ تم خدارا مجھے بخش دو۔''

کینوس پر وہی دو مانوس آنکھیں تھیں: آگ برساتی ہوئی آنکھیں جن کے دہکتے گڑھوں سے دو لپٹیں اٹھ کر لہراتے ناگوں کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی تھیں اور پل بھر میں برق کی طرح اس کی آنکھوں کو کاٹتی ہوئی اس کے جسم میں اتر گئیں۔ لمحہ بھر کے لیے وہ مر گیا۔ پھر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور یوں ہی سر جھکائے جھکائے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ عجیب سی آواز تھی: جیسے نشیب میں کوئی پھاوڑے سے زمین کھود رہا ہو۔ اس کے قدم اسی وقفے وقفے سے آتی ہوئی آواز کی راہ پر اضطراراً بڑھنے لگے۔ کئی کمروں سے گھما پھرا کر یہ آواز اسے ایک تہ خانے کے دروازے تک لے آئی۔ اس نے جھک کر فرش میں گڑے دروازے کا پٹ اٹھایا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ اندر ایک آدمی عجیب دیوانگی کے عالم میں واقعی زمین کھود رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ان آنکھوں کے سحر کو بھول گیا اور تازہ کھدی زمین کے ملبے کے پاس آ کھڑا ہوا اور حیرت سے یہ عمل دیکھنے لگا۔ آدمی نے اس کی موجودگی پر ذرا توجہ نہ کی، بس زمین پر پھاوڑا چلاتا گیا۔ اس کے علاوہ گویا اسے کوئی اور کام ہی نہ تھا۔ دیر تک کھڑے رہنے کے باوجود وہ اس حرکت کا مطلب نہ سمجھ سکا، چناں چہ بول پڑا:

''کون سا خزانہ گڑا ہے یہاں؟''

''خزانہ؟'' آدمی نے بغیر سر اٹھائے اور پھاوڑا چلاتے ہوئے کہا، ''ایک مرحلے پر یہ سالے کسی خزانے سے کم نہیں۔''

کون سالے؟—اس نے نظریں گاڑ کر دیکھا: کیڑے جنھیں وہ سڑک پر چھوڑ آیا تھا، مختلف راہوں سے ہوتے ہوئے گویا سب کے سب یہیں چلے آئے تھے۔ یہ ان کی آزادی کی انتہا تھی۔ تو گویا دو قدم علاحدہ چل کر راستے پھر مل جاتے ہیں! اور زندگی کی معنی آفرینی کا عمل، جو مکمل جزیرگی میں شروع ہوتا ہے، اختتام سے پہلے اچھا بھلا براعظم بن جاتا ہے! وہ سب کے سب زمین میں گھس گئے تھے، اور یہ آدمی پھاوڑے کی مدد سے بہ مشکل انھیں زمین کے جسم سے علاحدہ کر کے نکالتا اور یہ پھر دم کی دم میں زمین میں اتر جاتے۔ ''کیا کر رہے ہو؟''

''کیا کر رہا ہوں؟'' آدمی ذرا کی ذرا پھاوڑے کے ہتھے پر ٹکتے ہوئے بولا، ''خوب سوال ہے۔ دیکھتے نہیں، جذبے نکال رہا ہوں۔''

''یہ تو کیڑے ہیں۔''

''نہیں جذبے ہیں! تمھیں کیڑے نظر آتے ہیں—واہ۔ یہ بھی ایک رہی۔ عجیب گاؤدی ہو، میاں۔ یہ سالے جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ نہ دن کو چین، نہ رات کو قرار۔ ہمہ وقت سر پر سوار۔ اور بعض وقت تو یہ سالے میرے ننھے فیلڈ مارشل پر بھی سوار ہو جاتے ہیں،'' آدمی نے اپنے پاجامے کی طرف اشارہ کیا، پھر بولا، ''میں برسوں سے نہیں سویا ہوں۔ جب تک ان کو نکال باہر نہیں کروں گا، سو بھی نہ سکوں گا۔ مگر یہ سالے جُل دے جاتے ہیں۔ کیا تمھیں یہ تکلیف نہیں دیتے؟''

''پتا نہیں۔ کبھی کبھی کھٹمل ضرور تکلیف دیتے ہیں۔ تم بیٹھے جذبے نکالتے رہو، میں چلا۔''

وہ زینہ چڑھ کر اوپر آیا اور پھر انھیں کمروں میں چکرانے لگا۔ واپس چلنا چاہیے،—اس نے فیصلہ کیا—یہ تھانا وانا نہیں۔ کہیں اور چل کر رپورٹ درج کرائیں گے۔

وہ مایوس ہو کر لوٹنے کا راستا تلاش کر رہا تھا کہ ایک جگہ آ کر اس کے قدم منجمد ہو گئے۔ برابر والے کمرے میں کچھ لوگوں

کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں، جن کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو بھی رہے ہوں، خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ وہ کھڑکی تک آیا اور شیشے کے عقب سے اندر جھانکنے لگا۔

اندر سات آٹھ لمبی لمبی خوں خوار پٹھان مونچھوں والے، الف ننگے آدمی بیٹھے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ میز پر آبی رنگ کے شیشے کی ایک بڑی سی صراحی رکھی تھی، جس میں شراب کی گرم، قرمزی سطح اتر چکی تھی۔ یہی سیال ان سب کے آگے رکھے ہوئے گلاسوں میں بھی تھا۔ ان کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور اتنی سرخ تھیں کہ مارے دہشت کے اسے کپکپی آ گئی۔ ان کے درمیان ایک برہنہ عورت تیزی سے رقص کر رہی تھی۔ اس کا رقص اس قدر تیز تھا گویا ایک ہی لمحے میں وہ پورے کمرے میں موجود تھی، اس کے وسط میں اور ہر کونے کھدرے میں؛ بجلی کا، کوندتی بجلی کا رقص تھا یہ، اور اس قدر تیز رو کہ عورت کو نظریں جما کر دیکھنا مشکل تھا۔ پھر وہ عورت دھم سے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی غیر معمولی پھولی پھولی چھاتیاں تنفس کی تیزی سے بری طرح لرز رہی تھیں۔ اس کے جسم پر دانتوں کے زخم تھے۔ چھاتیوں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر عورت کے چہرے پر جا پڑی...

''اماں!'' وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا۔ وہ الف ننگے آدمی قہقہے لگاتے بھوکے بھیڑیے کی طرح عورت کے جسم پر ٹوٹ پڑے۔ ''اماں!'' اس کی آواز کی گونج بتدریج بیٹھنے لگی اور اس کے فنا ہوتے ہی ایک دوسری آواز بلند ہونے لگی: ''تم یہاں نہیں کھڑے رہو گے! تم یہاں سے چلے جاؤ گے!''

''مگر میں ایک حادثے کی رپورٹ درج کرانے آیا ہوں۔''

''ہمیں معلوم ہے،'' وہی دہشت ناک، گرم آواز پھر گونجی، سردیوں میں اندھیروں کے مکمل راج میں، سناٹے میں دی جانے والی صبح کی اذان کی طرح جو سوتے ہوئے ماحول کے جسم کے ہر گوشے میں سم جائے۔ ''جاؤ، نکلو یہاں سے!''

وہ سر لٹکائے چل دیا۔

۷

وہ تھانے کا احاطہ اپنے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب پکّی سڑک کے بجائے کچّے میں ناہموار زمین پر مضمحل قدموں سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف کھیت تھے جن کے درمیان سے ایک پگڈنڈی لہراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اسی پر ہولیا۔ سڑک پر چلنے کے احساس ہی سے جانے کیوں اسے کپکپی آ گئی تھی۔

چلتے چلتے وہ ایک میدان میں نکل آیا۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ ڈال کر کوئی میل بھر مربع قطعۂ ارض کی حد بندی کی گئی تھی۔

احاطے کے دائیں سرے والے کونے میں ایک بہت بڑا بورڈ لکڑی کے ایک وزنی لٹھے سے گڑا ہوا تھا۔ وہ جب بورڈ کے قریب آیا تو اس پر درج تھا:

# فیکٹری

ان لوگوں کا مسکن جنھوں نے قسمت سے بغاوت کی
اور وقت کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش

عجیب وغریب نوعیت کا یہ بورڈ دیر تک اس کے ذہن میں چکراتا رہا۔ آخر یہ کس قسم کی فیکٹری تھی جس کی سرے سے کوئی عمارت ہی نہ تھی۔ پھر بورڈ پر رقم ان دو جملوں اور فیکٹری کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ ان لوگوں کا مسکن...

پھر جب ذہن وشعور سب اس عقدے کو سلجھانے سے عاجز رہ گئے اور اس کی کن پٹی کی رگیں اس طرح تن گئیں کہ اب پھٹیں جب پھٹیں تو وہ بلا کچھ سوچے سمجھے جھٹ جھاڑ جھنکاڑ کی باڑھ پھلانگ کر احاطے میں داخل ہو گیا۔

احاطہ کیا تھا اچھی بھلی کباڑی کی دکان تھا۔ کیا نہیں تھا یہاں: چاروں طرف سائیکلوں کے ٹوٹے پھوٹے، مڑے تڑے فریم، مڈگارڈ، پہیے، ٹائر، اسپوک، بیرل، چین — جانے کیا کچھ الم غلم بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔ یکا یک اس کی پنڈلیاں لڑکھڑا گئیں اور جیسے ہڈیوں کا گودا بہ پڑا۔ ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے انسانی اعضا بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کھوپڑیاں، دانتوں کے چوکھٹے، شکستوں سے چور استخوانی ڈھانچے...

خوف کی ایک نوکیلی لہر اس کے جسم کو کاٹتی چلی گئی۔ وہ پہلے لمحے بھر کو سناٹے میں آیا اور پھر اضطراراً ایک جست لگا کر باڑھ کے باہر نکل آیا۔ نکل آیا تو دیکھا کہ وہی لوگ جنھیں تھانے کی عمارت میں کلیلیں کرتے دیکھا تھا، اسٹریچر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جب وہ نزدیک آئے تو بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکل گیا، ''یہ کیا جگہ ہے؟''

''بورڈ پر اتنے موٹے حروف میں 'فیکٹری' لکھا ہے کہ کوئی اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔''

''مگر یہ کیسی فیکٹری ہے؟ اور دوسرے جملے کا فیکٹری سے کیا تعلق ہے؟''

''یہاں ڈیزل آئل بنتا ہے''

''کاہے کا؟''

''ان اجسام کا جو تقدیر سے بغاوت کرتے ہیں اور وقت کی حدود پھلانگنے کی کوشش۔''

اس کی نظر اسٹریچر پر جا پڑی۔ اس پر اسی دوڑ لگانے والے سائیکل سوار کا ٹوٹا پھوٹا جسم اور اس کی سائیکل کے پرزے بکھرے پڑے تھے۔ وہ دہل گیا۔

''مگر یہ ڈیزل کس کام آتا ہے؟'' سوال اس نے اپنے اسی دہلنے کو چھپانے کے لیے کیا تھا۔

''اس سے سرخ رنگ کی وہ ڈبل ڈیکر بس چلتی ہے جس سے ناحق دوڑ لگا کر لوگ اپنے پاگل پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ بس کے لیے ایندھن ساز فیکٹری ہے۔ سمجھے؟''

یہ سنتے ہی وہ اپنی پوری قوت سے بھاگنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ اور راستا معدوم۔

۸

روئیں دار، بہت ساری دھنکی فلفی روئی کے دودھیا، سحابی غبار سے اٹھتی ہوئی وہ چھوٹی چھوٹی برجیوں والی عمارت عہدِ وسطیٰ کے کسی شاتو کی مانند نظر آ رہی تھی جس سے ننھے ذہنوں کی ملاقات پریوں کی کہانیوں والی رنگین کتاب میں اکثر ہوا کرتی ہے۔ وہ کھل کھلا کر ہنس دیا۔ جیسے بے آواز روشنی غبارے میں بھری ہوا کی طرح اس کے جسم میں سما گئی ہو اور وہ اس کے سہارے ہلکا ہو کر، دھیرے دھیرے، فضا میں بلند ہونے لگا ہو: مسرت کے آسمانوں کی طرف، جن کی راہ میں بادلوں کے شانوں پر بلند ہوتی ہوئی دھنک کے پل سے ہو کر گزرنا پڑتا ہو، جس کا دوسرا سرا کہیں نامعلوم اقلیموں میں بچھے غسقی اندھیروں میں گرتی ہوئی برف کے گالوں کی دودھیا خنکی میں کھو گیا ہو...

میرا گھر آ گیا! میرا گھر: زمانے کی پکی پکی نامہربانیوں کے خلاف بہجت کی آخری کمیں گاہ؛ جہاں ہر طرف خوش نما بیلیں اور پھول ہیں، اور جہاں ہر وقت ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی کا احساس ہوتا ہے؛ جس کے گھاس کے کشادہ قطعوں پر جب شام اتر آنے سے ذرا پہلے سورج ڈوبتا ہے تو ایک پگھلی پگھلی ارغوانی روشنی نہایت خوش دلی سے انھیں لہرا کے چومتی ہوئی گزر جاتی ہے...

میرے بہت سارے بھائی بہن ہیں، اور میری ماں نہایت حسین، ملنسار، اور خوش دل عورت ہے، جس کے چہرے پر ایک ایسیدل موہنی ملائمت سدا کھیلتی رہتی ہے جو صرف ازدواجی زندگی کی آسودگی اور وقار سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا باپ، بلند قامت اور وجیہہ، ایک پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ زندگی کے مصائب کے خلاف چٹان کی طرح سخت اور وقت آنے پر ریشم کی طرح ملائم۔ ہم سب اور ہماری ماں اس کے لیے قدرت کی وہ عنایت ہیں جس پر آدمی جتنا ناز کرے کم ہے۔

یہ گھر وہی گھر تھا جس میں اپنی پیدائش سے آج تک وہ ہر روز رہتا چلا آیا تھا۔ اس کے اندر کتنے کمرے تھے اور کون سی چیز کس جگہ رکھی تھی یہ بھی اسے معلوم تھا۔ مگر شک کی ایک توانا لہر آناً فاناً اس کے تیزی سے اٹھتے قدموں کا آہنگ برباد کر گئی: کیا

یہ واقعی میرا گھر ہے؟

اسی گومگو کی کیفیت میں وہ مکان کے آہنی پھاٹک تک آ گیا اور اندر رینگ گیا۔ کشادہ میدان کو عبور کر کے وہ برآمدے میں چلا آیا اور داخلی دروازے کی طرف پیش قدمی کی اور معاً ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا: میں تو جانتا بھی نہیں یہ کس کا مکان ہے! یہ میرا گھر نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ یہاں تو عجیب وحشت برس رہی ہے، ایسا لگتا ہے یہ عرصے سے ویران پڑا ہے، جیسے پرانے وقتوں کے تمام اچھے لوگ اپنی ساری اچھی نشانیاں لے کر کہیں اور کوچ کر گئے ہیں۔ نہیں، یہ میرا گھر نہیں ہو سکتا۔

وہ تیزی سے پیچھے کی طرف پلٹا اور طویل میدان عبور کر کے کھلے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ اچانک وہ دو خوف ناک آنکھیں، آمر النا ہی کی آنکھیں، اس کے ذہن میں گھوم گئیں، اور پھر ان سے رستی ہوئی آگ نے بڑھ کر اس کے چاروں طرف ایک سیال حصار کے طور پر گھیرا ڈال دیا۔ اس کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اس کے قدم تھم گئے۔ پھر جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اٹھا کر اسے دس گز پیچھے خود اس کے نقوشِ قدم پر پھینک دیا ہو۔ وہ لڑکھڑایا، سنبھلا، لیکن آگ کی تپش اسے جھلسائے دے رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اس سے کہہ رہی تھیں: ''ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو جلا کر بھسم کر دوں گا۔ لوٹ آؤ! تم واپس نہیں جاؤ گے!''

''مگر یہ میرا گھر نہیں۔ میرا گھر کہاں ہے؟''

وہ اسی غیر مرئی طاقت کی گرفت میں جکڑا ہوا اپنے قدموں پر لوٹنے لگا۔ پھر اسی آہنی پھاٹک سے اندر داخل ہوا اور تاریک میدان عبور کرتا ہوا برآمدے میں آ گیا، لیکن کھلے ہوئے داخلی دروازے سے اندر جاتے ہوئے اس کے قدم ہچکچائے۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ اس نے درد کی شدت سے آنکھیں بھینچ کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

کہیں دور، بہت دور مکان کے کسی گوشے میں گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ لمحات آگے بڑھتے رہے، لیکن کسی نے آ کر اسے پوچھا تک نہیں، جیسے اجڑے دیار کے بچے کھچے مکین خارجی دنیا سے اپنا آخری رشتہ بھی منقطع کر لینے کے درپے ہوں، پھر تمام دروازے بند کر کے اندر اپنی بالکل ہی الگ دنیا بسا لینا چاہتے ہوں، جس میں وہ من مانی کر سکیں، جہاں اصول نہ ہوں، نہ باہم مل جل کر رہنے کے قواعد۔

اسے معلوم تھا کہ یہ اس کا گھر نہیں، پھر بھی اس غیر مرئی طاقت کی گرفت میں بے بس وہ اندر جانے سے پہلے یقین کر لینا چاہتا تھا کہ آیا یہ واقعی اس کا گھر نہیں۔ اس نے دوبارہ کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

''کون؟''

اس کے ذہن میں دو بے رحم آنکھیں گھوم گئیں۔

''کیا یہاں میں رہتا ہوں؟''

''نہیں! یہاں تم نہیں رہتے۔ یہاں میں رہتا ہوں۔''

اس نے سوچا اب واپس چلنا چاہیے، مگر وہی کرخت آواز پھر گونجی: ''تم اندر آ ؤ گے — چلو!''

وہ غیر اختیاری طور پر کمرے میں داخل ہو گیا، جس کے ٹھیک بیچ میں ایک مصور مصلّیٰ پڑا تھا۔ اس کے دائیں سرے پر سجدے کے نشان سے ذرا الگ بیت اللہ کی تصویر پر ایک تسبیح دھری تھی۔ محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی نماز پڑھ کر اٹھا ہے۔ صوفے کے نزدیک تپائی پر چند رسالے رکھے ہوئے تھے جن کے اوپر ''پلے بوائے'' کا جنوری کا سال نامہ بالکل وسط سے کھلا ہوا تھا اور مس جنوری اپنے لباس سے آزاد زلط میں نہایت بھرپور تھی، کچھ یوں کہ پورے کمرے میں اس کے گدرائے جسم کی آہٹیں سانسیں لے رہی تھیں۔ تپائی کے بائیں کونے میں ''بال جبریل'' کی سرخ جلد کے اوپر ''کوک شاستر'' کا ایک مصور ایڈیشن بھی کھلا پڑا تھا اور اس صفحے پر درونِ آب آسن کا مع تصویر بیان تھا۔

لمحہ بھر کے لیے اس کا جی چاہا کہ جانماز کو تہ کر کے رکھ دے — کھلی پڑی ہو اور کوئی نماز بھی نہ پڑھ رہا ہو تو، سنا ہے، شیطان پیشاب پھر جاتا ہے — مگر اس خیال سے باز رہا کہ بہ ہر حال گھر اس کا اپنا نہیں، جانے قوانین کیا ہوں۔

وہ کمرے سے گزرتا ہوا اندرونی برآمدے میں نکل آیا اور کپڑے تبدیل کیے بغیر بے دم ہو کر بستر پر گر گیا۔

۹

جیسے ہر طرف ظلمت ہو اور غبار ہو، اور وہ اس میں آگے بڑھتا جا رہا ہو۔ چلتے چلتے راہ میں کہیں سے ایک زینہ آ نمودار ہوا۔ وہ بے سوچے سمجھے اس میں گھس گیا اور دیوانہ وار سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔ زینے کے دونوں طرف جو دیواریں تھیں ان میں گہرے غار تھے، مگر وہ ان غاروں سے نظریں چراتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ دھند میں غرق سیڑھیوں پر آگے فراز میں بہتے بہتے اسے بہت دیر ہو گئی۔ پھر دھند چھٹنے لگی۔ اندھیرے کسمسائے، لرزے، تڑپے، اور اپنی برہنگی میں روشنی کے خزینے کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ تاہم وہ اس روشنی کے منبعے کا سراغ نہ لگا سکا۔ کہاں سے اس قدر تیز، چندھیا دینے والی روشنی پھوٹ رہی ہے؟ وہ چڑھتا ہی رہا آخری سیڑھی نہ آئی۔ یہ کیسا زینہ تھا جس کی آخری سیڑھی ہی معدوم تھی؟ کیا وہ ساری عمر اس زینے پر چڑھتا رہے گا؟ اور اب تو شدت مشقت سے وہ بے دم ہو گیا تھا۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا، پیشانی عرق آلود تھی، اور سامنے اتنی تیز روشنی تھی کہ اس کی شدت سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

آخری سیڑھی نہ آئی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ معاً ساری روشنی گمبھیر اندھیرے میں مدغم ہو گئی۔ چاروں طرف تاریکی کی طنابیں کس گئیں۔ وہ سہم کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تیزی سے مڑا اور نیچے کی طرف ایک ایک جست میں کئی کئی سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔ بڑی

دیر ہوگئی اور آخری سیڑھی ندارد۔

تو آخر میں چڑھا کہاں سے تھا؟ اس کے سامنے زینے کا ناپیدا کنار نشیب تھا اور دائیں بائیں اندھے غار۔ وہ چکرا کر پھر اوپر کی طرف لوٹا۔ پھر وہی معمہ، زینے کا ہر دو جانب سے گویا کوئی سرا نہ تھا۔ اور تھا تو یا ازل میں یا ابد میں۔ وہی اس کے انتہائی سرے تھے اور ساری کائنات ان کے درمیان محبوس کر دی گئی تھی۔ تب اسے خیال آیا کہ کسی نے نہایت استادی سے اسے اس زینے میں قید کر دیا ہے۔

بہت دیر ہوگئی۔ اس کی بے کلی اپنے عروج پر تھی۔ ایک مرحلے پر اس نے عاجز آ کر، آنکھیں میچ کر، بائیں طرف والے غار میں اندھا دھند چھلانگ لگا دی۔ چند لمحے تک اندھے نشیب میں پھنسے پھنسے عمودی گرتے چلے جانے کے بعد اس کے قدم ٹھوس زمین سے جا لگے۔ اب وہ ایک تاریک غار میں چل رہا تھا۔ وہ اس غار میں دیر تک ٹامک ٹوئیے مارتا رہا۔ یہاں بھی وہی مصیبت: غار کا بھی کوئی اختتامی سرا نہ تھا۔ اس کا بس دہانہ تھا جو زینے میں کھلتا تھا، مگر یہ اس قدر بلندی پر تھا کہ اسے پھلانگ جانے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ پھر اگر زینے پر واپس چلا بھی جایا جائے تو کیا، وہ خود بھی ناپیدا کنار تھا۔ اندر گلی کوچوں کے پیچیدہ سلسلے تھے۔ وہ ایک گلی سے دوسری میں رینگ رہا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ خود اس کے وجود کو ایک دودھیا غبار نے اپنے حلقے میں لے رکھا تھا، اور یہ رقص کرتا ہوا حلقہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک نہایت متعفن اور غلیظ جوہڑ کے پاس سے گزرا تو کنارے پر پڑے پتھر پر ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ کیچڑی پانی کی غلیظ سی ایک دھار لتھڑی لتھڑی سی عورت کی ٹانگوں کے بیچ سے بہتی ہوئی جوہڑ میں گر رہی تھی۔ عورت کی پشت دیوار سے ٹکی تھی جس میں ایک دروازہ تھا۔ عورت کے قریب پہنچ کر اس کے قدم خود بہ خود رک گئے۔

''یا خدا—'' اس کی چیخ نکل گئی۔ مگر سب بے سود تھا۔ عورت پتھر سے اٹھ چکی تھی۔

''نہیں، نہیں۔ خدارا—'' اس نے اپنی پتلون کے بٹنوں سے الجھتی ہوئی اِن وجی لیٹر کی مشاق انگلیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم محض ایک تصور کے پیچھے اپنی ساری جوانی گنوا دو گے۔'' عورت نے لچائی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ!''

''نہیں، نہیں،'' وہ پھر چیخا۔ یکا یک اس کی نظر دیوار میں نصب دروازے پر جا پڑی اور وہ ایک ہی جست میں دیوانہ وار اس میں گھس گیا۔

اندر روشنی تھی۔ ایک طرف اس کا باپ، ماں، اور بہن بھائی بیٹھے تھے۔ یہ سب آپس میں نہایت ملائم لہجوں میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ پھر اس کی نظر ماں کے عقب میں شرماتی، لجاتی، چھپتی چھپاتی نغمہ پر جا پڑی جس کے چہرے پر حیا کی

دل فریب آگ تھی۔ گویا سب کے سب دیر سے پائیں باغ میں سہ پہر کی چائے پی کر ابھی ابھی درونِ خانہ آئے تھے۔

اسے یوں لگا جیسے وہ دھنک کے پل سے گزر کر، انجام کار، روئیں دار، بہت ساری دھنکی ہوئی فلفی روئی کے دودھیا، سجی غبار سے اٹھتی ہوئی اس چھوٹی چھوٹی برجیوں والی عمارت میں آ گیا ہے جو اس کا اپنا گھر تھی اور جس کے کشادہ قطعوں پر سہ پہر کی چائے پیتے وقت ستمبر کے ایک بے حد چمکیلے دن کی رخصت ہوتی ہوئی روشنی آنے والے دنوں کی مسرتوں، عنایتوں، اور مہربانیوں کا ان سے عہد کرتی ہوئی سرگیں اندھیروں میں اعتماد سے سما جاتی تھی۔ مگر اس کا سانس اس تیزی سے چل رہا تھا جیسے وہ صحراؤں کو کاٹتا ہوا یہاں پہنچا ہو، یہاں، اپنے گھر...

ان فرحت بخش در و دیوار میں اس نے آنکھ اٹھا کر محبت سے نغمہ کو دیکھا۔ وہ شرم سے دہری ہوگئی۔ پھر اس کے ننھے منے بہن بھائی آپس میں خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ امی نے ابا کی طرف بڑے معنی خیز انداز میں مسرت سے دیکھا۔

''کہاں کھو گئے تھے؟'' امی نے شفقت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب باہر رات بہت بھیگ گئی تو وہ سب اٹھے اور امی نے محبت سے کہا، ''میرا بیٹا— بس اب جلدی سے ایم۔ اے۔ کر لے۔ پھر دیکھ تیرے لیے کیسی اچھی دلہن لاتی ہوں!''

انھوں نے دوپٹے کا پلّو چباتی نغمہ کی طرف دیکھا۔ سب کھل کھلا دیے۔

وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ اچانک ایک عجیب الخلقت آدمی کہیں سے وارد ہوا اور دڑّاتا ہوا کمرے میں چلا آیا۔ اس کی آنکھیں— آمر النہار کی جلتی ہوئی آنکھیں— بے حد بھیانک لگ رہی تھیں۔ اس کا کوئی چہرہ ہی نہیں تھا۔ بس ایک صراحی سی تھی جسے بھوہڑ پن سے شانوں پر اوندھا دیا گیا تھا، جس میں کان، ناک، اور منہ کی جگہ پر بس سوراخ تھے، اور یہ صرف اس کی آنکھیں تھیں جن کی موجودگی میں اس پر انسان ہونے کا گمان کیا جا سکتا تھا۔

''ٹھہرو!'' عجیب الخلقت آدمی نے چلا کر کہا۔

ان سب کے قدم جم گئے۔

عجیب الخلقت آدمی نے بڑھ کر ان سب کو آہنی پھندے میں جکڑ لیا اور سختی سے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ لہو کے فوارے ان کے جسموں سے پھوٹ بہے اور تازہ تازہ گوشت کے لوتھڑے فرش پر گرنے لگے۔ نغمہ نے حسرت سے اس کی طرف آخری بار دیکھا اور پھر اس کا بے جان جسم پھندے سے پھسل کر نیچے لہو میں گر گیا۔

چاروں طرف تاریکی سنسنانے لگی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔

''سب کچھ ختم ہو چکا ہے،'' اس نے یاس سے کہا۔

۱۰

''چلو ناشتا بناؤ! پھر میری چلم بھر کر حقہ بھی تازہ کر دینا!'' وہی بھاری بھرکم شخصیت احکامات صادر کر رہی تھی۔ ''آج تمھاری ماں نہیں اٹھیں گی۔''

پھر گودام میں کچھ کھڑ بڑ ہوئی۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہی بھاری بھرکم آدمی گرد کے انبار سے ''کوک شاستر'' کا ایک پھٹا پرانا مصور نسخہ نکال رہا تھا۔ ... پھر خواب گاہ کا دروازہ بڑے زور سے بند کر دیا گیا... پھر کچھ سسکیاں: نہیں، نہیں! خدارا رحم کرو! بس، بس!'' پھر کسی کے کسی کو بھرپور قوت سے طمانچہ مارنے کی آواز آئی اور پھر عجلت میں بندِ قبا چاک کر دینے کی۔ دو حقیر کیڑے کنویں کے قعر میں اترنے لگے... دھیمے، بہت نیچے۔

وہ باورچی خانے میں رینگ گیا۔

ناشتا تیار کر کے وہ مکان کے باہر آیا۔ سامنے ڈاکیا آ رہا تھا۔ وہ عجیب اضطراری قدموں سے ڈاکیے کی جانب لپکا۔

''میرا کوئی خط؟'' اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''خط؟'' ڈاکیے نے عجیب استہزائی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''خط؟ ہنہ! نہیں، کوئی نہیں'' کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے اس مکان کی طرف لوٹ گیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں۔

[مطبوعہ، محمد عمر میمن، ''تاریک گلی: منتخب افسانے'' (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹)، صفحہ ۵۹-۱۰۲]

(عرض داشت: یہ افسانہ ۱۹۶۰ کی دہائی کے بالکل شروع میں لکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں کہیں چھپا بھی تھا۔ اب رسالے کا نام یاد نہیں رہا۔ م ع م)